اسی غرض سے اس مین مختلف پیشون اور صنعتون کے طریقے، اور ان کے نسخے درج ہین، رسالہ کارآمد ہے،

بچون کی کتاب، از جناب حامد علی بی اے، ال ٹی، حجم ۲، صفحے، قیمت ۳ر پتہ، مکتبۂ جامعۂ دہلی،

یہ بچون کے لئے ایک مفید اور کارآمد رسالہ ہے، جس مین ایک لڑکے اسد کو ہیرو قرار دیکر مختلف عنوانون سے الگ الگ چھوٹے چھوٹے قصے اور مضمون درج ہین، اور اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ سب مضامین ایک سلسلہ مین ہو رہین، کہین کہین اسباق کا خلاصہ اردو نظم مین بیان کیا گیا ہے، جو بچون کے لئے زیادہ دلچسپ ہوگا، لکھائی چھپائی بچون کے مناسب ہے،

ریحانِ حمید، از جناب مولوی حمید الزمان خانصاحب حمید شاہجہان پوری، حجم ۸۰ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ، مطبوعہ آگرہ اخبار، آگرہ، قیمت اور پتہ درج نہین،

ریحانِ حمید کے نام سے مصنف کے فارسی غزلیات قطعات، ایک فارسی خط، اور چند اردو غزلون کا مجموعہ شائع ہوا ہے،

انتخاب مصحفی، مرتبہ مولوی سید حبیب احمد صاحب آفق کاظمی، ناشر منیجر کتب خانہ حبیبیہ، محلہ کنگوئی امروہہ، یوپی، حجم ۴۴ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت ۴ر

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے چھ دیوانون کا یہ مختصر انتخاب ردیف وار تیار کیا گیا ہے،

رسالہ ہمایون کا افسانہ نمبر، گذشتہ مہینہ مین اردو کے رسالون کے خاص نمبرون پر تبصرہ کرنے کے بعد رسالہ ہمایون کا افسانہ نمبر ملا، جو بڑے اہتمام سے تیار کیا گیا ہے، ادارۂ ہمایون نے افسانہ کے لئے ایک مقابلہ کا اعلان کیا تھا، تین افسانے مقابلہ مین منتخب ہوئے، جنھین ۲۵، ۲۵ اور ۵ کی رقمین بطور انعام دی گئین، یہ افسانے بھی اس نمبر مین چھپے ہین، اس کے علاوہ اکثر افسانے غیر زبانون سے ماخوذ ہین، ضرورت ہے کہ آیندہ مقابلہ مین طبعزاد افسانہ کی شرط لگائی جائے کہ ہمارے نوجوان ادیبون کی جودتِ طبع کا حال بھی معلوم ہو، افسانے قریب قریب سب اچھے ہین، اس نمبر کی قیمت ۸ر ہے اور رسالہ کے خریدارون کو اسی سالانہ قیمت ۵ر مین یہ بھی ملیگا، پتہ:- منیجر رسالہ ہمایون نمبر ۲۳، لارنس روڈ، لاہور،

"ر"

جلد ۳۴	ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۳ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۳۴ء	عدد ۴

مضامین

شذرات

خوشی کی بات ہو کہ ہر سال یورپ کے متعدد افراد از خود یا مسلمانوں کی تبلیغ یا اسلامی ممالک کی سیاحتوں اور عینی مشاہدوں کے اثر سے دینِ حق کو قبول کرتے ہیں، اور ایسا نظر آتا ہے کہ اسلامی ممالک سے قریب تر یورپین ملک آسٹریا اور ہنگری یورپ میں اسلامی تبلیغ کے مرکز بن کر رہیں گے، عربی اخبارات میں ان ممالک کے نومسلم مسلمانوں کے جو حالات وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اسلام انگریز نومسلموں کی طرح حصولِ شہرت، جلبِ منفعت اور ندرت پرستی کا نتیجہ نہیں،

ڈاکٹر جرمانوس جو شانتی نکیتن بنگال میں اسلامی علوم وفنون کے پروفیسر بنکر آئے تھے، اور یہیں انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تھا، وہ اپنے وطن آسٹریا ہنگری میں واپس جاکر نہایت مفید خدمات انجام دے رہے ہیں، انھوں نے تمام نومسلم مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کیا ہے، ایک اسلامی درسگاہ کے افتتاح کی کوشش کی ہے، اور اپنے عربی ملک کے بھائیوں سے برابر مراسلات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، چند مصری مجاہدینِ دین بھی اس کام میں اُنکی رہبری کر رہے ہیں،

ہمکو اپنے تمام نومسلم بھائیوں میں سے سب سے زیادہ جسکی شخصیت نے متاثر کیا ہے وہ آسٹریا کے ایک گمنام نومسلم لیوپولڈ وائس معروف بہ **محمد اسد** ہیں، موصوف ایک اخبار کے مراسلہ نگار کی حیثیت سے اسلامی ملکوں کی سیاحت پر مامور ہوئے، انھوں نے عربی ممالک کی سیاحت کی اور مسلمانوں سے میل جول بڑھایا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گئے، سالہا سال حجاز میں گذارے، اور وہاں ایک عرب خاتون سے نکاح کیا، اب تقریباً دو برس سے ہندوستان میں ہیں، گذشتہ سال لاہور کے جلسۂ حمایت اسلام میں، اور امسال جامعہ ملیہ دہلی کی ایک تقریب میں ان سے ملاقات ہوئی، وہ ایک ایسے نومسلم نظر آئے جنکو دیکھکر مغرور پشتینی مسلمانوں کو شرمانا چاہئے، وہ نہ صرف عقیدہ کے مسلمان ہیں، بلکہ فرائض وسنن ومستحبات ا

ن ومعاشرت تک میں مسلمان ہیں، وہ یورپین ہیں جو نہ صرف مسیحی عقیدہ کے بلکہ یورپین تمدن کے مخالف ہیں، عربی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں، اور انگریزی اتنی جانتے ہیں کہ اُس میں لکھ پڑھ سکیں،

موصوف کے دل میں اسلام کی بڑی عظمت ہے، اور وہ اُسکو حقیقتِ حقہ جانتے اور یقین کرتے ہیں، اور اُن کے دل میں لگن ہے کہ وہ اسلام کی کوئی حقیقی خدمت بجا لائیں، اب انھوں نے اپنا لائحہ عمل (پروگرام) مرتب کر لیا ہے، اور قرولباغ دہلی میں "عرفات" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر لیا ہے، اسکی طرف سے عنقریب وہ ایک انگریزی رسالہ کے اجراء کا ارادہ رکھتے ہیں، اور عرفات بکڈپو کے ذریعہ سے اپنی تصنیفات کی اشاعت کا سامان کر لیا ہے،

چند ماہ ہوئے کہ موصوف نے اپنی ایک مختصر لیکن جامع کتاب "اسلام اَن کراس روڈ" (اسلام راہ عبور پر) بزبان انگریزی شائع کی ہے، (عرفات بکڈپو، قرول باغ، دہلی) اس میں موجودہ حالات وخیالات کے پیش نظر اسلام کی تعلیم کو بطور قانونِ نجات کے پیش کیا ہے، اسی ضمن میں یورپ کے تمدن اور رجحاناتِ دماغی کی تنقید کی ہے، بعض مسلمانوں میں اس وقت یورپین تجدد اور احادیث وسننِ نبویہ سے روگردانی کی بدعتوں کو "اصلاح" کے نام سے پیش کرنے کی جو افراط وتفریط پیدا ہو رہی ہے، اسکی غلطیاں نہایت صحت اور نکتہ سنجی کے ساتھ ظاہر کی ہیں، کتاب کے اس باب کو پڑھکر اپنے ان نئے خیال کے دوستوں کو حافظ کا یہ شعر سنانے کو جی چاہتا ہے،

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبی است،

قرآن پاک کے صحیح وخالص انگریزی ترجمہ کی ضرورت کا احساس مسلمانوں میں روز بروز بڑھ رہا ہے، اگست کے شذرات میں ہمنے جناب مولنا عبد الماجد صاحب دریابادی بی اے، کے انگریزی ترجمۂ قرآن کا ذکر کیا تھا، اب انکا ترجمہ چار پاروں تک پورا ہو چکا ہے، وہ حواشی میں توضیحِ مطالب کیساتھ معترضین کے جوابات بھی دیتے جاتے ہیں، اور عیسائیوں اور مستشرقوں کے شکوک اور اعتراضات کو بھی دور کرتے جاتے ہیں، ہم کو اُسوقت اسکی خبر نہ تھی کہ علامہ عبد اللہ یوسف علی صاحب بھی قرآن پاک کا انگریزی

میں ترجمہ کر رہے ہیں، پنجاب کے دوستوں سے اسکی اطلاع پا کر بے حد خوشی ہوئی،

موصوف کا فضل وکمال نہ صرف انگلستان بلکہ پورے یورپ میں مسلم ہے، ان کی انگریزی زبان دانی پر انگریزوں کو بھی رشک ہے، وہ عربی زبان سے واقف ہیں، اور صاحب علم ونظر علمار کے مشورے بھی ان کو حاصل ہیں، وہ پوری مستعدی اور انہماک کیساتھ ترجمہ کے کام میں مصروف ہیں، دو ماہ ہوے کہ انکے پہلے پارہ کا ترجمہ چھپکر شائع ہوگیا، انگریزی کے مسلمان اہل فضلار کی رائیں دریافت کیں تو سب نے اسکی فصاحت وخوبی وبلندی کی متفقہ تعریف کی، ہمکو تو صرف یہ دیکھکر تسلی ہوئی کہ انھوں نے تاویلات کی گمراہی سے کلیتہً احتراز کیا ہے، اور معجزات کو عقلی حماقتوں کا بازیچہ گاہ نہیں بنایا ہے، معانی کے سمجھنے میں اہل زبان مفسرین کی تفسیروں سے مدد لی ہے، اور متعلقہ آیات میں اسرائیلیات کے بجائے خود بائبل کے حوالے دئے ہیں،

یہ ترجمہ اشرف بک ڈپو کشمیری بازار لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے، اسکی چھپائی کا کام گو لاہور ہی میں ہو رہا ہے مگر اسقدر عمدگی اور خوبی کیساتھ چھپ رہا ہے کہ ظاہری تجمل وصورت میں بھی اُن ترجموں سے کم نہیں، جنکو لندن سے چھپوا کر منگوایا گیا ہے، ایک کالم میں متن قرآن فوٹو بلاک میں، بالمقابل انگریزی ترجمہ موٹے ٹائپ میں، اور نیچے حواشی باریک ٹائپ میں چھاپے گئے ہیں، ہر دو ماہ میں ایک پارہ کا ترجمہ شائع ہوگا، ہر حصہ کی قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول ہوگی، ضرورت ہے کہ انگریزی خواں مسلمان بکثرت اس ترجمہ کو خریدیں، تاکہ شیخ محمد اشرف صاحب کی جنھوں نے اس ترجمہ کی اشاعت کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے، حوصلہ افزائی ہو، اور کام وقت پر پورا ہو سکے، انھوں نے یہ بھی آسانی کی ہے کہ جو خریدار دو روپیہ بھیجکر اپنا نام مستقل خریداروں میں درج کرائیگا، اسکو محصول ڈاک معاف کر دینگے،

ہمارے پاس ہانگ کانگ (ساحل چین) سے وہاں کی اسلامک لٹریری سوسائٹی کی روداد بابت ۱۹۳۳ء آئی ہے، سوسائٹی نے دوران سال میں مفید اسلامی رسائل وکتب کی اشاعت کا کام کیا ہے، اور ارادہ رکھتی ہے کہ آیندہ چینی زبان میں تبلیغی کتابوں کی اشاعت کرے، اس روداد میں یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ ہماری مسلم یونیورسٹی کے ایک طالب علم حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری اس سوسائٹی کی تحریری مدد کرتے ہیں،

مقالات

کوئٹہ اور ملتان

کوہستانی سڑک | شام کا وقت تھا، اور ایک بڑی چڑھائی باقی تھی، اور یہ وہی طویل کوہستانی سلسلہ تھا جو افغانستان کو ہندوستان سے الگ کرتا ہے، چمن اور کوئٹہ کے بیچ میں یہ ایک سد سکندر ہے، جس کے عبور کرنے کے بعد کوئٹہ سامنے آجاتا ہے، ریل اس پہاڑ کے نیچے سے سرنگ سے ہو کر گذرتی ہے، اور موٹر اور لاری اور پیادہ مسافر اس پہاڑ کو عرض میں قطع کرتے ہیں، اور اس کو عبور کرکے اس پار سے اُس پار ہوتے ہیں، پہاڑ پر چڑھائی کے لئے حکومت انگریزی نے پہاڑ کو کاٹ کر اور جگہ جگہ نشیب وفراز کو ہموار کرکے موٹروں اور پیادہ چلنے والوں کے لئے نہایت عمدہ سڑک تیار کی ہے، قدم قدم پر موڑ آتے تھے، ادھر ادھر بغل میں غار اور خندقیں ملتی جاتی تھیں، شوفر کی ذراسی غلطی موت کا پیغام تھی، مشکل راستوں پر انگریزی میں ہدایتیں لکھی تھیں،

موٹر نے آہستہ آہستہ اوپر چڑھ کر بیچ پہاڑ کے نشیب وفراز میں قدم رکھا، عمدہ سڑک ہونے کے باعث پہئے خود بخود پھسلے جاتے تھے، اور وہ بڑی تیزی سے راستہ قطع کرتی جاتی تھی، خوش قسمتی سے کوئی دوسری موٹر مخالف سمت سے آتی ہوئی نہیں ملی، اس لئے ہمارا شوفر اس ڈر سے اپنی موٹر بے تکان بھگا رہا تھا کہ رات ہونے سے پہلے وہ اس دشوار راہ کے خطروں سے باہر ہو جائے، اس جلدی پر بھی شام ہو ہی گئی،

روحانیات کا ذکر | عجیب اتفاق کہ راستہ تو یہ خطرناک درپیش تھا اور ڈاکٹر اقبال صاحب نے روحانیات کے ذاتی مشاہدات وتجارب، اور ایک سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی، گفتگو طرفین سے نہایت دلچسپ ہو رہی

تھی، اس عہد کے مختلف شیوخ اور بزرگانِ سلاسل کا تذکرہ رہا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے آغازِ زندگی اور طالب علمانہ عہد کا ذکر چھیڑا، پھر اپنے والد مرحوم کا تذکرہ کیا، کہ وہ خود ایک صاحبدل صوفی تھے، اور دینداروں کی صحبت میں رہتے تھے، اس ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حیاتِ خفتہ کے تاروں میں جس مضراب نے حرکت پیدا کی وہ خود اُن کے والد ماجد کی ذاتِ بابرکات تھی،

اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی طالب علمی کے عہد کے ایک قصہ کے اثنا میں اپنے والد مرحوم کا یہ ایسا فقرہ سنایا جسنے میرے دل پر بھی اثر کیا، فرمایا کہ اپنے وطن سیالکوٹ میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا، ایک صبح کو حسبِ دستور میں تلاوت میں مصروف تھا، کہ والد مرحوم ادھر آئے اور دریافت کیا کہ کیا کرتے ہو، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کرتا ہوں، فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمھارے قلب پر بھی اسی طرح اترا ہے، جیسے محمد رسول اللہ صلعم کے قلبِ اقدس پر نازل ہوا تھا، تلاوت کا مزہ نہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، فرمایا کہ جب بی اے پاس کروگے تو بتاؤنگا، کچھ دنوں کے بعد جب انھوں نے بی اے پاس کر لیا تو اس خوشخبری کے معاوضہ میں اس دن کی گفتگو کا حوالہ دیکر اس مقام کے حصول کی تدبیر پوچھی، مرحوم نے انکو کچھ وظیفے اور دعائیں تلقین کیں، اور نوجوان بیٹے سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان و قلم سے ملتِ محمدیہ کی خدمت بجا لائیگا،

ڈاکٹر صاحب کی شاعری ان کے والد مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی اور ایک عالم ان کے نغمہ سے سرشار و مست تھا، اور مسلمانوں میں وہ قیامت انگیز تاثیر پیدا کر رہا تھا، اور بالآخر باپ اپنے بیٹے کی اس عیسیٰ نفسی سے مسرور ہو کر اس دنیا سے سدھارا،

پہاڑی راستہ اب ختم ہوا، اور میدان کا منظر نمایاں ہو رہا تھا، مغرب کے قریب پہاڑ کے نشیب میں میدان آیا، آبادی کا کچھ کچھ نشان نظر آیا، اور سیدھی سڑک دکھائی دی، اس سڑک پر آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا شہر ملا جس کے چھوٹے سے دورویہ بازار سے ہو کر سڑک نکلی ہے، یہاں پہنچنے کے ساتھ موٹر روک دی گئی، اور پولیس کے ایک سپاہی نے آگے بڑھکر ایک رجسٹر پیش کیا، جس پر غلام رسول خان بیرسٹر (رفیق ڈاکٹر اقبال) نے دستخط کر دیئے

جس کے بعد ہم آگے بڑھے، معلوم ہوا کہ یہاں سے ہر گذرنے والے کا نام درجِ رجسٹر ہوتا ہے،

مغرب اور عشا کے بیچ میں جب تاریکی خوب پھیل رہی تھی، بجلی کے چراغوں کی روشنی دور سے قطار در قطار نظر آنے لگی، یہ کوئٹہ تھا، اس تاریکی میں روشنی کا یہ منظر آسمان پر جھلملاتے ہوئے ستاروں کا سماں دکھا رہا تھا، رفتہ رفتہ شہر قریب آیا، افغانی سفارت متعینۂ دہلی کے نمایندہ نے ہمارے لئے یہاں کے ڈاک بنگلہ میں تین کمرے لے لئے تھے، وہیں آکر قیام ہوا،

تمام بستر و سامان لاری پر تھا، اور وہ پیچھے رہ گئی تھی، کوئٹہ میں اس وقت خاصی سردی تھی، ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں آتشدان روشن تھا، اور ہم سب اس کے گرد بیٹھے لاری کی آمد کا انتظار کر رہے تھے، رات کی تاریکی اور سردی بڑھتی جاتی تھی، اور لاری کا انتظار سخت سوہانِ روح کا باعث ہو رہا تھا، سب سے بڑے ڈر کی چیز یہ تھی، کہ رات کی تاریکی میں کہیں لاری کو کوئی صدمہ نہ پہنچا ہو، اس لئے ہم سب بہت پریشان تھے، وقت گذرتا گیا، اور وقت کیساتھ پریشانی بھی بڑھتی گئی، بالآخر دس بجے رات کے قریب لاری آئی، اور معلوم ہوا کہ راستہ بخیریت گذرا، کابل میں جو بستر اور بکس اور سوٹ کیس لاری پر رکھے گئے تھے، ان کو آج پہلی دفعہ یہ موقع ملا کہ زمین پر قدم رکھیں، ان دشوار گذار راستوں کے ہچکولوں، اور اتار چڑھاؤ کے جھٹکوں میں ان کی پوری درگت بنگئی، چمڑے کے بکسوں کے اکثر کونے اور گوشے تو لاری کی رگڑ سے کٹ کٹ گئے تھے، بستر بندوں کے کپڑے اس سفر کے مشکلات کی تاب نہ لاکر اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر روزن دار ہو گئے تھے، مگر

شکر للہ کہ جنازہ بمنزل برسید

ہم سب نے کھانا ڈاک بنگلہ کے ڈائننگ روم میں کھایا، کھانا انگریزی تھا، مگر بہت معمولی اور بہت خراب پکا تھا، ناچار پاؤ روٹی اور مکھن پر گذر کیا،

لاری پہنچنے کی خوشی ہم سب کو بہت ہوئی تھی، میں آتشدان کے پاس بیٹھا تھا، لاری پہنچنے کی خوشی میں دفعۃً ٹھنڈک میں باہر نکل آیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ رات بھر بخار اور خفیف لرزہ میں مبتلا رہا، صبح کو اٹھا تو طبیعت

ہلکی تھی، نماز پڑھی، اور تھوڑی دیر کے بعد چائے پیکر پیادہ تنہا شہر دیکھنے کو نکلا اور اسٹیشن تک گیا،

کوئٹہ یہ برطانی بلوچستان کا صدر مقام ہے، اور سمندر کی سطح سے پانچہزار قدم بلند ہے، کہتے ہیں کہ اسکا پرانا نام
کوٹ تھا، اور ایک معمولی دیہات سا تھا، ۱۸۷۶ء میں سر رابرٹ سینڈیمن نے جب اس پر قبضہ کیا، اور قلعہ تعمیر کیا،
جسکا نام ان کے نام پر فورٹ سینڈیمن ہے، تو اسکا تمام زبانوں پر کوئٹہ ہوگیا یہ ہندوستان کا سب سے بڑا جنوبی فوجی
مرکز ہے، یہاں سے ایک ریلوے لائن ایران کی سرحد دُزداب تک جاتی ہے، دوسری سڑک قندھار کو جہاں سے
ہم آئے تھے، اور تیسری ریلوے لائن کراچی کو جو یہاں سے پانچ سو میل دور ہے، اور چوتھی لائن سکارپور ہوکر
بہاولپور اور ملتان سے لاہور کو جاتی ہے،

یہ ایشیاے وسطی، ایران، افغانستان اور ہندوستان کی تجارت اور بیوپار کی مرکزی منڈی ہے، میوے
بکثرت اور تازہ بتازہ ملتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ خشک میوون کی قیمت ہندوستان کے دوسرے شہروں سے
کم نہیں، مجھے صرف بادام کا تجربہ ہے، دوستون نے کہا کابل میں خریدنا بے کار ہے، انھیں داموں میں کوئٹہ میں
ملیں گے، مگر یہ خیال غلط نکلا، کابل میں بادام کابلی بارہ آنے فی سیر تھے، پشاور میں ہندوستانی بارہ آنے فی سیر
دام ہیں، لیکن کوئٹہ میں ڈیڑھ روپیہ سیر ملے، انگور اور انار البتہ سستے ہیں،

مکانات زیادہ تر بنگلہ نما ہیں، جچھتیں لکڑی اور کھپروں کی ہیں، سڑکیں کشادہ اور صاف ہیں، آبادی میں
مسلمانوں کا حصہ غالب معلوم ہوتا ہے،

رات کو آتے ہوئے کوئٹہ کو رواروی میں دیکھا، صبح اٹھکر سیدھی سڑک پر چلا تو اسٹیشن پہنچ گیا، سڑک
کے دونوں طرف بنگلے تھے، اسٹیشن بہت بڑا اور بہت پر رونق تھا، چھاؤنی کی وجہ سے ہر طرف فوجی چہل پہل
معلوم ہوتی تھی، قلی پشتو، بلوچی، سندھی، فارسی، اردو سب ہی زبانیں بولتے تھے،

اسٹیشن سے واپس پھرا تو ایک صاحب نے جو کلاہ و دستار اور کوٹ اور شلوار میں ملبوس تھے پیچھے سے
مولنا کہکر مجھے ٹھہرانا چاہا، میں ٹھہر گیا، وہ دوڑتے ہوئے پاس آئے، اور پہلے اپنی اس حرکت کی معافی مانگی، پھر پاسپورٹ

دیکھنا چاہا، اور روانگی کا وقت پوچھا اور سفر کی سمت دریافت کی، اور ارشاد کیا کہ میں خفیہ پولیس میں انسپکٹر ہوں،
اور اپنی خدمت اور ادائے فرض سے مجبور ہوں، اور یہ بھی کہا کہ آج صبح سر راس مسعود صاحب اسی بات پر خفا ہوگئے،
میں نے کہا آپ جو کچھ پوچھنا چاہیں خوشی سے دریافت کریں، چنانچہ ان کے تمام مطلوبہ معلومات فراہم کردیئے، اور
ان کے سوالات کے جوابات دیدیئے، وہ شکریہ ادا کرکے واپس گئے،

راہ میں ملتان پڑتا تھا، میرے ایک عزیز (مولوی سید عبدالباری صاحب) مدت سے ملتان میں رہتے ہیں،
ریلوے دفتر میں ملازم ہیں، سالہا سال سے ان کا تقاضا تھا کہ میں کبھی ملتان آؤں، یہ موقع بے منت ہاتھ آیا،
اُن کو تار دیا کہ کل دوپہر کو میل سے آتا ہوں،

۱۰ بجے کے قریب ہم لوگ ڈاک بنگلہ سے چل کر اسٹیشن آئے، انسپکٹر صاحب موصوف موجود تھے، انھوں
نے اپنی مہربانی سے اسباب کے تلوانے اور ٹکٹ لینے میں مدد فرمائی، ۱۱ بجے کے قریب گاڑی آئی، اور ہم لوگ آرام سے
سوار ہوکر روانہ ہوئے، راستہ بہت پر لطف تھا، جگہ جگہ پہاڑیاں مل رہی تھیں، کچھ دور کے بعد صاف ریگستان
آگیا، اور گرد وغبار اور ریت سے واسطہ پڑا، پشاور سے کلکتہ تک براہ پٹنہ جو راستہ ہے جس قدر وہ معمور ہے، اسی
قدر یہ راستہ ویرانہ تھا، گھنٹوں کے بعد بھی کوئی آبادی نہیں آتی تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اس کو سرسبزی
اور شادابی سے محروم ہی رکھا ہے، اب سندھ کا ریگستان شروع ہوگیا تھا، کہیں کہیں جو اسٹیشن آجاتے تھے، انھیں
میں کچھ آبادی کا سراغ ملتا تھا، تاہم یہ خوشی ہورہی تھی کہ عمر میں پہلی دفعہ اس راہ سے گذر رہا ہوں، جس پر فاتحین
اسلام کے کارواں صدیوں چلتے رہے،

بہاولپور ریل اسیطرح دن بھر اور رات بھر چلتی رہی، مشہور مقامات میں سے جیکب آباد اور سکارپور گذرے،
دوسرے روز کچھ دن چڑھے بہاولپور آیا، چونکہ نوابان بہاولپور اور خصوصاً جدہ ماجدہ صاحبہ مرحومہ نواب صاحب
بہاولپور نے ندوۃ العلما کی ہمیشہ مالی امداد فرمائی، اس لئے میں نے بڑے شوق کی نظر سے اسکی طرف دیکھا، اور
اسسے ایک اُنس سا معلوم ہوا، اس ریاست کے فرمانروا عباسی نسل سے ہیں، احمد شاہ ابدالی کے زمانہ میں انھوں نے

سندھ کے اس حصہ پر حکومت قائم کی، رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت پنجاب کے عہد میں ان کو زیر کرنا چاہا، ۱۸۱۸ء میں
ستر ہزار کا نذرانہ بھی بجبر حاصل کیا، اگر یہ بہت جلد اس سے آزاد ہوکر انگریزوں سے ملحق ہو گئے، موجودہ عہد میں
عباسیہ ریاست مذکور کی علمی ترقیوں کی سب سے بڑی دلیل ہے، سندھ کا مشہور شہر اُچ اسی ریاست کے اندر واقع ہے
ناصر الدین قباچہ کے زمانہ میں یہاں مدرسہ فیروزی واقع تھا جس میں طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج سراج
مدرس مقرر ہوئے تھے،

ملتان ۱۲ بجے کے قریب ملتان آیا، سید عبد الباری صاحب، کپتان محمد عظیم صاحب اگزیکیٹو افسر ملتان چھاؤنی
سید عبد الغنی صاحب بی اے وائس پریسیڈنٹ کینٹونمنٹ بورڈ، سید میر حسن صاحب رئیس ملتان وغیرہ موجود تھے
اسٹیشن سے سیدھے سید عبد الباری صاحب کے قیامگاہ پر آیا، احباب آتے رہے اور ان سے ملاقاتیں ہوتی
رہیں، ان میں سب سے دلچسپ شخصیت سید میر حسن صاحب رئیس ملتان چھاؤنی کی تھی، ساٹھ ستر کے درمیان
عمر ہوگی، آنکھوں سے معذور ہو چکے ہیں، تاہم کتابوں اور رسالوں کا شوق باقی ہے، وہ خود اب نہیں پڑھ سکتے
تو دوسروں سے پڑھوا کر سنا کرتے ہیں، سرسید کے خیالات سے بہت متاثر ہیں، مگر اب امید ہے کہ اس رد عمل سے
وہ متاثر ہو رہے ہیں، جو سرسید مرحوم کی فطرت پسندی کے باب میں اب عمل میں آرہا ہے،

علاوہ دوسرے دوستوں کے یہاں کی جامع مسجد کے خطیب و امام مولانا سید اشفاق علی صاحب فاضل
دیوبند سے مل کر خوشی ہوئی، یہ روشن ضمیر بھی ہیں، اور روشنخیال بھی، ملتان کے زمانہ قیام میں جو تین روز تک
ممتد رہا موصوف کی صحبت سے بڑی دلچسپی رہی،

ہمارے نوجوان دوست پروفیسر اکبر صاحب منیر جن سے مدت سے مراسلت تھی، اور جو ایران کی سیاحت سے
ہمارے لئے جدید فارسی شاعری کا تحفہ لائے تھے، اور جنکا دیوان ماہ نو چھپکر شائع ہو چکا ہے، اور جنکی نظموں کے ذریعہ
سے معارف کے ناظرین بھی ان سے آشنا ہیں، وہ خوش قسمتی سے آجکل یہیں کے گورنمنٹ کالج میں فارسی کے پروفیسر
تھے، اُن سے پہلے لاہور میں ملاقات ہو چکی تھی، یہاں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی، منیر صاحب جدید فارسی اور

اردو کے نازک خیال شاعر ہیں، اور اخلاقاً نہایت متواضع اور خاکسار ہیں،

ملتان ہماری اسلامی تاریخ کا نہایت قدیم اور نہایت مشہور شہر ہے، یہی وہ شہر ہے جسکو مسلمانوں نے محمد بن
قاسم ثقفی کے زیر سرکردگی پہلی صدی ہجری کے آخر میں جب فتح کیا تو اس وقت سے لیکر سکھوں کے عہد تک ہمیشہ
اسلامی حکومت کا ایک اہم مرکز رہا، غزنویوں کے فتوحات سے صدیوں پہلے یہاں مسلمان آباد تھے، اور ان کی
اسلامی حکومت قائم تھی، چوتھی صدی کے اواخر میں یہاں کی عربی حکومت مصر کے فاطمیہ کے زیر سایہ اسماعیلیت
میں بدل چکی تھی، اور اسماعیلی امراء یہاں حکومت کرتے تھے، انھیں کا نام ہندوستان کی تاریخوں میں ملاحدہ اور
باطنیہ آتا ہے، محمود غزنوی نے اس کو باطنیوں کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی سلطنت میں ملحق کیا، غزنویوں کے
ضعف کے بعد پھر اسماعیلیوں نے اس پر قبضہ کر لیا، اور آخر شہاب الدین غوری نے ان کے ہاتھوں سے دوبارہ اسکو لیا،
غزنویوں کی آمد سے پہلے تک یہ شہر عربوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا، غزنویوں کی فتح سے اسکا تعلق
مصر کے بجائے غزنین سے ہو گیا، تاہم یہ ہر دور میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہا، علامہ بیرونی المتوفی ۴۴۰ھ
نے بھی یہاں قیام کیا تھا، چشتیوں کو چھوڑ کر تصوف کا دوسرا خانوادہ جو ہندوستان میں سب سے زیادہ پھیلا وہ
سہروردی تھا جس کے بانی حضرت شیخ ابو النجیب شہاب الدین سہروردی المتوفی ۵۶۳ھ تھے، سہروردی خاندان
کے فیوض و برکات کا سرچشمہ بھی شہر ہے، شیخ الاسلام بہاؤ الدین زکریا ملتانی (ولادت ۵۷۸ھ - وفات ۶۶۶ھ)
نے ترکستان و خراسان و عراق و حرمین محترمین سے علوم دینی کا اکتساب کیا تھا، ابو حفص عمر شہاب الدین سہروردی
المتوفی ۶۳۲ھ سے جو ابو النجیب شہاب الدین سہروردی کے بھتیجے اور مرید تھے، تصوف کی دولت حاصل کی، اور
عراق سے اسکو ملتان میں منتقل کیا، مشہور صوفی شاعر عراقی اسی میخانہ کے جرعہ خوار تھے،

غزنویوں کا تو حال معلوم نہیں، مگر غوریوں کے عہد میں ناصر الدین قباچہ نے جو سلطان التمش کا معاصر اور
سندھ کا فرمانروا تھا، یہاں پہلی علمی درسگاہ قائم کی جسمیں مولانا قطب الدین کاشانی نے ماوراء النہر سے آکر
درس و تدریس کی سند بچھائی، یہ شیخ الاسلام بہاء الدین کا آغاز عہد تھا، وہ بھی یہاں آیا کرتے تھے، شیخ فرید الدین

گنج شکر (ولادت ۵۸۴ھ ۔ وفات ۶۶۹ھ) نے بھی مولنا تاج الدین ترمذی سے یہیں فقہ کی تعلیم حاصل کی،

خراسان وایران سے جو علماء اور اہل کمال اس راستہ سے ہندوستان آتے تھے، ان کی پہلی منزل یہی شہر ملتان ہوتا تھا، اس سبب سے یہاں علماء وفضلاء کا بڑا مجمع رہتا تھا،

علاء الدین خلجی کے زمانہ میں جو علماء، امام وقت تھے ان میں چار بزرگ ملتان کے تھے، مولنا محب الدین ملتانی، مولنا حمید الدین ملتانی، مولانا شہاب الدین ملتانی، اور مولنا علیم الدین نبیرۂ شیخ الاسلام ملتانی، یہ دہلی اگر علوم عقلی ونقلی کے درس دیتے تھے، ہندوستان میں معقولات کا درس میں داخل ہونا بھی ملتان ہی کے طفیل ہوا، ملتان کی بربادی کے بعد سلطان سکندر لودھی کے زمانہ میں شیخ عبد اللہ اور شیخ عزیز اللہ ملتان سے آئے، اول الذکر نے دلی میں، اور آخر الذکر نے سنبھل (مراد آباد) میں ہنگامۂ درس گرم کیا،

ملتان کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس کی شدید مشابہت قندھار سے ظاہر ہوتی ہے، وہی خام مکانات، وہی ریگستان، وہی بارش کی کمی، لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان جیسی ایک بارش بھی ملتان میں ہو جائے تو وہاں کے اکثر مکان گر جائیں، ملتان کے متعلق ایک مشہور شعر زبان زد ہے،

چار چیز است تحفۂ ملتان گرد و گرما، گدا و گورستان

جہاں ریت ہو اور بارش کی کمی ہو وہاں کی گرمی کا کیا پوچھنا، اور گرد وغبار تو ریگستان کا جوہر ہے، گداؤں کا زور پہلے ہو گا مگر اب شاید نہ ہو، تاہم ایسے درویش یہاں بہت ہیں، جو گو بزرگوں کی گدیوں کے بوریا نشین ہیں، مگر ان کی زندگی امیرانہ ہے، اور یہ رنگ غالباً حضرت شیخ الاسلام زکریا سہروردی کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا، چنانچہ شیخ الاسلام کے پوتے حضرت رکن عالم سلاطینِ دہلی کے مقرب تھے اور بقول ابن بطوطہ وہ حاکم ملتان کی منظوری کے بغیر کسی کو اپنا مہمان بھی نہیں بناتے تھے، اور گورستان کا کیا پوچھنا کہ اس پرانے شہر کا چپہ چپہ اسلامی عظمت کا ایک ایک مدفن ہے،

چپہ چپہ پہ ہے یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

بڑے بڑے علماء اور بزرگوں کے مقبرے اور مزارات ہیں جنہیں سے سوائے اُن کے جن کی نسل میں جاگیریں ہیں، باقی بے نشان ہیں، مدفن سے مولد یاد آیا، کہتے ہیں کہ ملتان کو ایک اور فخر یہ حاصل ہے کہ اس کی سرزمین عظیم الشان بادشاہوں کا مولد ہے، سلطان محمود تغلق (ناصر الدین محمد شاہ؟) سلطان بہلول لودی اور سلطان احمد شاہ ابدالی، ان تینوں بادشاہوں کی جائے پیدائش بھی لوگ بتاتے ہیں، سلطان محمود تغلق تو دروازہ سے کچہری جانے والی سڑک کے ایک محلہ میں جسکو ٹلہ تولہ خاں کہتے ہیں، پیدا ہوا، سلطان بہلول لودی کی ولادت حسین اگاہی میں ہوئی، اور سلطان احمد شاہ ابدالی کا مولد کمشنر صاحب کے بنگلہ کے قریب لبِ سڑک ایک مکان تھا جو اب بے نشان ہے، اگرچہ یہ واقعات شاید تاریخ کے رو سے درست نہ ہوں،

عصر کی نماز کے بعد دوستوں کے ساتھ ملتان کے قابل دید مقامات کی سیر کو نکلا، عربی تاریخوں میں ملتان کے ایک مشہور مندر کا ذکر آتا ہے، جس کے اندر سے سندھ کے عرب فاتح محمد بن قاسم ثقفی کو بڑی ضرورت کے وقت بہت سا سونا ہاتھ آیا تھا، اس نے اس مندر کو توڑا نہیں، بلکہ اصلی حالت پر چھوڑ دیا، اور اس کے قریب ایک جامع مسجد بنوا دی، اس کے بعد جو عرب ریاستیں یہاں قائم ہوئیں، انھوں نے بھی اسکو نہیں چھیڑا بلکہ یہاں کے جاتریوں پر ٹیکس لگا کر خوب آمدنی حاصل کرتی ہیں، مگر دور ہو جانے پر جب کبھی کوئی ہندو راجہ اُن پر حملہ کرنا چاہتا وہ یہ کہکر اس کو ڈراتی تھیں کہ اگر تم نے ذرا ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ہم اس مندر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینگے، اس دھمکی سے وہ ڈر جاتا تھا اور ملتان پر حملہ نہیں کرتا تھا، بیرونی نے کتاب الہند میں لکھا ہے کہ اس کے بعد جب باطنیوں نے ملتان پر قبضہ کیا تو جلم بن شیبان اسماعیلی نے ثقفی کی جامع مسجد کو بند کر کے اس مندر کو توڑ کر جامع مسجد کر دیا، بعد ازیں جب سلطان محمود نے باطنیوں کو شکست دیکر ملتان کو فتح کیا تو مندر والی مسجد کو ویران کر کے پھر پہلی جامع مسجد کھولدی،

بیرونی کا چشم دید بیان ہے کہ اس مندر کی عمارت کی جگہ بلندی پر تھی، اور اینٹ سے بنی تھی لیکن اس کے زمانہ میں اس کے اکثر حصے میدان ہو چکے تھے، سیر کے لئے نکلتے وقت مجھے یہی چیز پہلے یاد آئی،

لوگون نے کہا یہ مندر اب تک باقی ہے اور اب اس کا نام پرہلاد پوری ہے،

پرہلاد پوری کا مندر یہ مندر موجودہ شہر سے باہر پرانے قلعہ کی جانب شمال ایک بلند مقام پر واقع ہے، اسی سے متصل شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کی قدیم خانقاہ ہے، موجودہ عمارت اینٹ کی بنی ہوئی ہے، پھاٹک کے بعد ایک وسیع صحن ہے، چاروں طرف سائبان ہے، اس میں پرہلاد نرسنگھ بھگت اور لکشمی مہاراج کی مورتیاں ہیں، اس مندر کے اندر مسلمانوں کو نہیں جانے دیتے، اس لئے اندر کی کیفیت معلوم نہ ہوسکی،

اس مندر کے متعلق مقامی روایت یہ ہے کہ اب سے تیس لاکھ برس پہلے یہاں ہرنیہ کشیپو نام ایک راجہ حکمرانی کرتا تھا، یہ راجہ خدائی کا دعویٰ کرتا تھا، تمام رعایا کو حکم تھا کہ وہ راجہ ہی کی پوجا کرے، جو اس سے سرتابی کرتا اس کی سزا موت تھی، اتفاق سے راجہ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جسکا نام پرہلاد رکھا گیا، جب سن شعور کو پہنچا تو اس نے اپنے باپ کی خدائی سے انکار کیا، اس کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں، مگر باز نہ آیا، آخر تنگ آکر ہرنیہ کشیپو نے ایک آہنی ستون کو آگ سے سرخ کیا اور پرہلاد کو حکم دیا کہ وہ اس ستون سے چمٹ جائے، اس حکم کی تعمیل میں اس نے جب اس ستون سے چمٹنا چاہا تو فوراً ستون بیچ سے پھٹ گیا، اور اس میں سے ایک شخص نمودار ہوا جس نے راجہ کو مار ڈالا، اسی واقعہ کی یادگار میں ایک مدت کے بعد یہ مندر تعمیر ہوا،

علامہ بیرونی کا بیان ہے کہ "یہ مندر سورج دیوتا کا تھا، اور اسی لئے اس کا نام آدت تھا، یہ لکڑی کا بنا ہوا تھا، اور اسکی دونوں آنکھوں میں دو سرخ یاقوت جڑے تھے، اور بدن پر سرخ رنگی ہوئی کھال تھی" لیکن اب ان چیزوں کا وجود نہیں،

۱۸۴۸ء کی انگریزوں کی لڑائی میں اس مندر کو کافی نقصان پہنچا تھا، جس کی مرمت بعد کو ہوگئی، اس مندر پر بہت سے اوقاف ہیں، مندر کا انتظام نرسنگھ مندر کمیٹی کرتی ہے،

خانقاہ و مزار حضرت بہاء الدین زکریا یہ خانقاہ جو اب مزار کی صورت میں ہے اس مندر سے بالکل ملا ہوا اسکی مغربی سمت میں واقع ہے، میرا خیال ہے کہ اگر یہ پرہلاد مندر وہی ادت دیوتا والا پرانا مندر ہے تو عجب نہیں کہ یہ خانقاہ پہلے وہ مقام ہو

جسکو مسجد بنا دیا تھا، ملتان میں یہ خانقاہ "بہاء الحق" کے نام سے مشہور ہے، کہتے ہیں کہ اس خانقاہ کی تعمیر حضرت بہاء الدین زکریا نے خود کرائی تھی، اور یہان بیٹھکر چالیس برس تک حدیث کا درس دیا تھا، خانقاہ کا رقبہ بہت وسیع ہے، دو بڑے پھاٹک ہیں، اردگرد عمارتیں بنی ہوئی ہیں،

پھاٹک کے بعد پہلے ایک صحن ہے، صحن کے بعد ایک گلیارا سا ہے، جس کو طے کرنے پر اصل مقبرہ آتا ہے، جو ایک بڑے کمرہ کی صورت میں ہے، اس کے اوپر گنبد ہے، مقبرہ کے اندر بیچ میں حضرت شیخ الاسلام بہاؤ الدین زکریا ملتانی سہروردی کا پختہ مزار ہے، مزار کے اوپر سیاہ شامیانہ تنا ہے، اس مزار کے ہر طرف بہ ترتیب اُن کی اولاد و احفاد کی قبریں ہیں، باہر خدام اور مجاور بیٹھے زائرین سے نذریں وصول کر رہے تھے، میں سیدھے حضرت کے مزار پر گیا، دعائے مسنونہ پڑھی، مقبرہ کے اندر خاصی تاریکی تھی، تاہم آنکھیں بند کرتے ہی ایک نور سا چمک گیا، سہروردی خاندان کا سرتاج یہاں محو استراحت ہے، میں سبب نہیں جانتا تاہم دل نے ایک اثر محسوس کیا، اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے نکل کر ڈھلک گئے،

شیخ الاسلام سہروردی کا سالانہ عرس ہوتا ہے، بادشاہوں نے یہاں بہت کچھ وقف کیا تھا، مگر اب چند دیہات رہ گئے ہیں، خان بہادر شیخ مرید حسین قریشی اس کے متولی ہیں، اور غالباً انھیں کے خاندان میں تولیت محدود ہے، شیخ الاسلام کے مزار کے برابر ان کے بزرگ صاحبزادہ اور جانشین حضرت صدر الدین المتوفی ۶۸۴ھ کا مزار ہے، یہ وہی بزرگ ہیں، جن کے عہد میں سلطان غیاث الدین بلبن کا نامور بیٹا محمد سلطان خان شہید ملتان کا حاکم تھا، اور جس نے تاتاری حملہ کے سیلاب کو جسکے تھپیڑوں میں خلافت بغداد کی کشتی ڈوب گئی تھی، ملتان میں کامیابی کے ساتھ روک دیا تھا، اور آخر خود اسی واقعہ میں اتفاقاً شہید ہوکر "خان شہید" لقب پایا، حضرت امیر خسرو دہلوی بھی اس شہزادہ کے ساتھ اس ہنگامہ میں ملتان میں تھے،

(۲)

از پروفیسر تاثیر، ایم اے، کیمبرج،

محترمی حضرتِ علامہ - السّلام علیکم،

کل بحری ڈاک میں لاہور سے برخوردار محمود نظامی کا ایک تحفہ موصول ہوا، آج اور کل اسی پر صرف ہوا، اپنی ریسرچ سب بھول گیا، رات کے دو بجے تک اور صبح ناشتہ کے ساتھ بھی وہی تحفہ تھا، وہ تحفہ کیا تھا؟ عمر خیام از سید سلیمان ندوی! "شعر العجم" کے بعد "شعر الہند" کی اشاعت سے اذیت پہنچتی تھی، اور علامۂ مرحوم کو مافوق البشر کہہ کر دل کو تسلی دے لیا کرتا تھا، مگر عمر خیام نے پرانی یادیں اور امیدیں پھر زندہ کر دی ہیں، اور تلافیٔ مافات ہوگئی ہے، یہ نقشِ اوّل نقشِ ثانی سے کلیۃً بے نیاز ہے، غالباً کسی اور زبان میں بھی اس شان کا مضمون اس موضوع پر جنگ شائع نہیں ہوا، خدا آپکی زندگی اور ہمت کو زیادہ کرے، آپ کا وجود ہمارے لئے غنیمت ہے،

میں نے کتاب کے اس سرسری مطالعہ میں چند مقامات پر پنسل سے کچھ نشانات لگائے ہیں، ان کی وضاحت چاہتا ہوں، یہاں میرے پاس نہ کوئی کتاب ہے (اردو فارسی کی) نہ کوئی اور ذریعۂ تحقیق، فضا مختلف ہے، کام الگ ہے، احباب اور طرح کے ہیں، فارسی کہاں، اردو کا بھی ایک لفظ مدتوں سننے میں نہیں آتا، اس لئے بہت ممکن ہے کہ میرے شبہات بالکل مبتدیانہ ہوں جنکا ازالہ آپ کو تکلیف دیئے بغیر ممکن نظر آتا ہو، مگر میرے لئے یہ سہل [illegible]

اوّل:- آپ نے عمر خیام کی ولادت اور وفات کا مسئلہ خوب واضح کر دیا ہے، لیکن ایک سو سال کی عمر کو محال محض فرض کرنا سمجھ میں نہیں آتا، بالخصوص جب یہ سو سال قمری ہوں، یعنی پورے سو سال شمسی نہ ہوں، ایک حکیم اگر یہ عمر نہ پا سکے تو ہم تو مارے گئے، یہاں ستر سال سے زیادہ عمر کے پروفیسر شبانہ روز کام کرتے ہیں، میرے اپنے

نگران سر آرتھر اپنے عام کام، لیکچرز، نگرانی کے علاوہ شعبۂ انگریزی کی صدارت کرتے ہیں، کئی ایک اور عہدوں کے ذمہ دار ہیں، اور پھر قریباً ہر سال ایک معرکۃ آرا تصنیف شائع کر دیتے ہیں، (انھیں عمر خیام بہت پسند ہے اور فٹز جیرلڈ کے اس وقت مداح تھے جب بہت کم لوگ اس کے ترجمے سے واقف تھے،)

عمر خیام کو آپ اتنی جلد ایاغ بنانے پر کیوں مصر ہیں، وہ زمانہ تو سکون و عافیت کا ہوگا، کم از کم ہوائی جہازوں اور موٹروں کی تگ و دو تو نہ تھی، مگر یہ تاریخی تحقیقات کا معاملہ ہے اور میری ہمدردی کے احاطہ سے باہر ہے،

دوم: رباعی کے قوافی کے سلسلے میں آپ نے عمارۂ مروزی کے چار مصرع نقل کئے ہیں، اور نہ جانے کیا استنباط کرنا چاہا ہے، مگر مجھے یہ چار مصرعے رباعی کے معلوم نہیں ہوتے، اور چوتھا مصرع غلط نقل ہوا ہے، است کی جگہ بہ چاہئے، یوں ؎

آں مے بدستِ آں بتِ سیمیں من نگر   گوئی کہ آفتاب بہ پیوست با قمر

واں ساغرے کہ سایہ بیفگند مے برد   برگِ گلِ سفید بگوئی بہ لالہ بر

نہ کہ ؎ برگِ گل سفید است گوئی بہ لالہ بر"

اور مستفعلن مفاعلن ہے، ع بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے، رباعی کا وزن کیسے ہوا، کیا یہ کان دھوکہ کھا رہے ہیں، یا آپ کچھ اور فرما رہے ہیں؟

سوم:- سلسلۂ ماسبق میں آپ نے محبی العزیز پروفیسر شیرانی کے "ادعائے چار بیتی" کا دو جگہ تذکرہ کیا ہے، میرے خیال میں یہاں کوئی لفظی الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے، جہاں تک مجھے یاد ہے وہ چار بیتی کو رباعی سے مختلف صنفِ سخن تصور کرتے ہیں، آپ چار بیتی اور رباعی کو ایک قرار دیتے ہیں، ترانہ کی طرح، اس لئے ان کا کہنا کہ چار بیتی کی اب کوئی مثال نہیں پائی جاتی، محض چار قوافی رباعی نقل کرنے سے غلط نہیں ہو جاتا، رباعی میں چار مصرعے ہوتے ہیں، چار بیتی میں بھی چار مصرعے ہوتے ہیں، رباعی میں قوافی کبھی تین کبھی چار، چار بیتی میں ہمیشہ چار قوافی ہوتے ہیں، رباعی عربی بحر ہزج سے مختص ہے، چار بیتی کے اوزان غالباً غیر

عربی قدیم ایرانی ہیں، یہ دعویٰ بلا دلیل سہی، مگر اس کی تردید میں عوفی سے چار قوافی رباعیات نقل کرنا غیر متعلقہ ہے،

میرے پاس نہ شیرانی ہیں نہ ان کا کوئی مضمون، نہ کبھی اُن سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی ہے جو یاد رہ گئی ہو، آپ کے اقتباسات ایک دھندلا سا خیال اور اپنی رائے ان کی بنا پر ماقبل الفاظ تحریر کرگئیں اور پھر یہ بھی اعتبار ہے کہ وہ گرگ بیشۂ تحقیق ایسا "نادر" دعویٰ کم کرتا ہے، جو یونہی لاطائل ٹھہر جائے، بڑا پیچ دار بزرگ ہے اور پکا عروضی، اور رباعی کے اوزان کے متعلق مجھے خود مروجہ مسلمات سے اختلافات ہیں، مگر وہ اور بحث ہوگی،

چہارم آپ نے رباعی کی ترویج کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، اور غالباً اس موضوع پر اور کسی نے کچھ بھی نہیں لکھا، مگر مجھے پہلی ہی وجہ سے ایک الجھن پیدا ہوگئی، آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ قصیدہ، مثنوی اور قطعہ (مروجہ اصنافِ سخن) میں لوگ حقائقِ حکمت کے علاوہ اور مضامین زیادہ باندھتے تھے اس لئے ایک نئی صنفِ سخن درکار تھی، یہ توجب تھا کہ "تصوف و حکمت" کے ٹھیکدار رباعی کے لئے مخصوص ہوجاتے، حالانکہ واقعات یہ ہیں کہ ہمیشہ مثنوی ان خیالات کے اظہار کا مشہور ترین آلہ رہی، عطار، رومی، اقبال کے نام اور تصانیف سب کو معلوم ہیں، دوسری وجہ دیتے ہوئے آپ نے مثنوی اور قصیدے کی طوالت کو پیشہ ور شاعر کے لئے مخصوص کرنا چاہا ہے، اور صوفیہ کی بے فرصتی کو بہانہ بنایا ہے اور اسے "ذکر و فکر عبادت" میں مخل گردانا ہے، ظاہر ہے کہ آپ ان رموز کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں، لیکن رومی اور عطار اور دیگر صوفیائے کرام کی لمبی لمبی مثنویوں کو دیکھتے ہوئے سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں پیشہ ور شاعروں سے الگ کیسے کیا جائے، اور "ذکر و فکر و عبادت" سے غافل کس طرح کہا جائے؟ اور یہ کیا ضروری ہے کہ صوفی شاعر پیشہ ور صوفی بھی ہو، آپ نے یہاں تیسری صنفِ سخن "قطعہ" کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ قلتِ وقت کی شکایت اس سے رفع ہوسکتی، قطعہ جو مصرعہ بھی ہوسکتا ہے اور زیادہ بھی، اس کے وجود سے آپ کی تیسری وجہ بھی کہ قصیدہ اور

مثنوی محض مسلسل خیالات کے کفیل ہیں، اسلئے متفرق خیالات غزل کی غیر موجودگی میں رباعی ہی میں آسکتے تھے، محض حسن ظن ہوکر رہجاتی ہے، یہ بھی یاد رہے کہ رباعی غزل کے بعد بھی قائم رہی اور رہے گی جس طرح قطعہ کے باوجود پیدا ہوئی اور قائم ہے، آپ کی چوتھی وجہ بھی جو رباعی کے اختصار مصاریع ہی پر مبنی ہے، قطعہ اور مختصر قصائد کے ہوتے ہوئے بے بنیاد معلوم ہوتی ہے، اگر گانے کے لئے چند اشعار ہی درکار تھے، تو قطعہ موجود تھا اور مثنوی کے مختصر ابواب و قصص تھے جو باقتضائے طلب اور زیادہ مختصر ہوسکتے تھے،

غرض یہ چوتھی دلیل بھی کچھ ایسی محکم نہیں، چھٹی وجہ کہ رباعی کو قول کہتے تھے اور قوال گاتے ہیں، بجائے خود مستقل دلیل نہیں، چوتھی کا اضافہ بن سکتی ہے اور ساتویں اور آخری وجہ تو بقول آپ کے محض "متفرق اقوال" کا مجموعہ ہے، میں نے پانچویں وجہ کو اب تک خارج از بحث رکھا ہے، کیونکہ یہی قول حقیقت کے قریب ترین ہے، آپ نے فقط اس قدر لکھا ہے کہ "رباعی کے وزن کو موسیقی کی لے سے کوئی خاص مناسبت تھی"۔ وہ خاص مناسبت کیا ہے؟ لے اور موسیقی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟۔ آپ کے نزدیک الفاظ کے معانی اور اصوات کا کیا تعلق ہے، کیا موسیقی سے مراد ملائم آوازیں ہیں، داغ کے اس "مصرعۂ میمی" کی طرح ع کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں، یہ سوالات جواب طلب ہیں، مگر یہ ظاہر ہے کہ رباعی کی ترویج کا راز اس کے وزن میں ہے، آپ نے "اقسام البحور" کی رباعی میں بداہت کی طرف توجہ مخصوص کردی حالانکہ اصل بات مصرعۂ اول میں ہے ع در بحر ہزج زحاف بسیار آمد زحافات کا ہونا اور "بسیار" ہونا، سو جوابوں کا ایک جواب ہے، اس سے رباعی میں اختصار کے ساتھ ایک ایسا تنوع اور یگانگت کا امتزاج ممکن ہوگیا ہے جو اور اصناف میں نایاب ہے، اور بحر بھی مناسب ہے، وہ کس طرح؟

مگر اس بحث کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے،

اب فصل پنجم آتی ہے، آپ نے حافظ و خیام کے مجمع نسخوں کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں (ص ۲۸۱) "ندوۃ العلما" کے نسخے کے متعلق لکھا ہے کہ "خط و کاغذ کے لحاظ سے دو تین سو برس کا پرانا معلوم ہوتا ہے" یہ محاورۂ زبان ہی سہی، مگر تاریخی تحقیقات میں دو سو برس اور تین سو برس میں پورے سو سال کا فرق ہوتا ہے

اور یہ بڑا فرق ہے، عمر خیام کی عمر کے متعلق آپ کو یہی سو سال پوری صدی معلوم ہوتے تھے، اگر میری یاد وفا کرتی دیتی تو لاہور میں بھی ایک نہایت عمدہ اور قیمتی نسخہ موجود ہے، مجی ابو الاثر حفیظ جالندھری یا حفظ الرحمن صاحب جامع حفظ العلوم اس کے متعلق بالیقین کہہ سکتے ہیں،

آپ نے لاہور کے سید سلیم کے نسخۂ عمر خیام کا ذکر بھی کیا ہے، مجھے لاہور جیسے بڑے شہر میں ہر صاحب ذوق و علم یا جامع کتب سے تعارف کا دعویٰ نہیں، لیکن ایسا نایاب نسخہ چھپا نہیں رہتا، کہیں یہ سید سلیم صاحب محترمی خواجہ سلیم۔ ایم اے، ساکن محلہ کوٹھیداراں تو نہیں؟ ان کے پاس ایسے خزائن ہیں، اور عمر خیام بھی ہے، آپ مجی العزیز خواجہ عبد الوحید یا پروفیسر تبسم سے دریافت کریں، وہ "سید" اور "خواجہ" کا جھگڑا مٹا سکیں گے،

میرے یہ سوالات کتاب کے اصل موضوع سے دور ہیں، اور ان کی صحت یا تغلیط سے آپ کی کتاب بے نیاز ہے، مگر مجھے امید ہے کہ آپ فرصت کا وقت نکال کر ان کی طرف متوجہ ہو سکیں گے، مناسب ہو تو اس خط کو شائع فرما دیں، جواب بھی ساتھ ہی، کیونکہ یہ سوالات اوروں کے لئے خیال افروز ہونگے،

(مورخہ ۱۰ / مئی سنہ ۱۹۳۴ء)

توضیح و توجیہ

از

سید سلیمان ندوی،

سپاسگذار ہوں کہ میری اس حقیر تالیف کی نسبت آپ نے اس حسنِ ظن کا اظہار فرمایا ہے، مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری کوشش کے باوجود اس میں کچھ نہ کچھ نقائص ضرور ہونگے کہ کوئی انسانی کام خطا و نسیان سے یکسر پاک نہیں ہو سکتا، امورِ مستفسرہ کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کرتا ہوں،

۱۔ میں نے سو سال کی عمر کو "محالِ محض" کہیں نہیں کہا ہے، بلکہ یہ کہا ہے اکہ

خیام کی ولادت کا سال پانچویں صدی ہجری کے اوائل کا سال (تا آنکہ نظام الملک طوسی المولود ۴۰۸ھ کی ہمسنی ثابت ہو) اس وقت تک فرض نہیں کیا جا سکتا جب تک ہم اس کی عمر غیر معمولی اور غیر طبعی تسلیم نہ کریں، جسکا اندازہ ایک سو سولہ برس تک کیا جا سکتا ہے، اور اس حالت میں لازم آئیگا کہ حسب ذیل سنین کے وقت حسب ذیل عمر کا ہو، (۱) ۴۶۷ھ میں رصد خانہ کی تعمیر کے وقت وہ انسٹھ برس کا ہو، (۲) ۵۰۶ھ میں جب وہ نیشاپور سے بلخ گیا تھا . . . . تو وہ اٹھانوے برس کا ہو (۳) ۵۰۷ھ جب ابو الحسن بیہقی اپنے بچپن میں اس سے ملا تھا اور خیام نے اس کا امتحان لیا تھا، اس وقت اس کی عمر ننانوے برس کی ہو، (۴) ۵۰۸ھ کے موسم سرما میں جب سلطان مرو میں شکار کھیلنے نکلا تھا اور خیام اس کو خود سوار کرانے گیا تھا تو اس وقت اس کی عمر سو برس ہو،

ان (سنین) میں سے رصد خانہ کی تعمیر کے وقت کا سال گو چنداں بعید نہیں، مگر بقیہ سنین تمام تر طبعی حالات کے خلاف ہیں، اگر ایسا ہوتا تو ضرور تھا کہ بیہقی اور نظامی عروضی ان سنین کے ذکر کیوقت اوس کی حیرت انگیز غیر طبعی قوت اور عمر کا استعجاب کے ساتھ ذکر کرتے، جیسا کہ اس قسم کے مستثنیٰ عمر والوں کے حالات میں اہل تاریخ نے ذکر کیا ہے۔ (صث خیام)

منشا یہ ہے کہ اُسکے ان سنینِ عمر میں اگر نظامی اور بیہقی اس سے ملے ہوتے اور اس کو اس عمر میں اس طرح سرگرم کاموں میں مشغول پاتے تو اس کی اس طویل عمر کا ذکر استعجاب کے ساتھ ضرور کرتے، جیسا کہ اس قسم کے مستثنیٰ واقعات کا ذکر مورخین اور اہل تذکرہ طبعاً کیا کرتے ہیں،

۲۔ عمارہ مروزی کا یہ قطعہ یا رباعی جو چاہے کہئے میں نے لباب الالباب عوفی (جلد دوم ص۲۵ طبع یورپ) سے نقل کی ہے، اس میں عوفی جیسے ماہرِ ادب نے اس کو رباعی ہی کہہ کر نقل کیا ہے، اس کی تصحیح و تحشیہ کا کام اس عہد کے نامور ایرانی فاضل علامہ محمد بن عبد الوہاب قزوینی نے کیا ہے، انھوں نے بھی یوں ہی رہنے دیا ہے اور اس نظم کے چاروں مصرعے بھی اسی طرح ہیں، جس طرح میں نے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں، (لباب الالباب جلد دوم ص۲۵)

آتنا لکھنے سے صحتِ نقل کا بار تو میرے سر سے اتر گیا، البتہ عقل و قیاس کا سوال باقی رہ گیا، آپکا یہ کہنا بجا

ہے کہ اس کا وزن بحرِ ہزج کے عام اوزانِ رباعی میں سے نہیں ہے، مگر اس کی جو تقطیع آپ نے کی ہے وہ بھی صحیح نہیں

ہے، بحرِ رمل میں مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن میرے علم میں نہیں آیا ہے، اور نہ اس وزن کو اہلِ عروض

نے اس بحر کے منشعبات میں شمار کرایا ہے،

یہ چاروں مصرعے غالباً بحرِ مضارع میں ہیں، جسکا اصلی وزن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن ہے،

اور ان مصرعوں میں یہ زحافات کے بعد مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن ہو کر آیا ہے، چوتھا مصرع میں نے صحیح

نقل کیا ہے، اور وہ اسی وزن پر ہے، برگِ گُ مفعولُ - لِ سپیدش فاعلاتن - تُ گوئی بَ مفاعیل، لاز

بر فاعلن - تین پہلے مصرعوں کا بھی یہی وزن ہے، آں می بَ مفعولُ، دست آں بُ فاعلات، تَ یمین

مفاعیل من نگر فاعلن،

عرفی کا اس کو رباعی کہنا، اور قزوینی وغیرہ مصححین کا اس پر کوئی اعتراض نہ کرنا یا تو یہ معنی رکھتا ہے کہ عرفی

کے عہد میں اوزانِ رباعی کی یہ تخصیص نہیں ہوئی تھی جو بعد میں ہوئی، یا اس کے یہ معنی ہیں کہ لوگ ہر چار مصرعی

کی نظم کو رباعی کہدیتے تھے، چنانچہ عرفی نے اسی صفحہ میں ایک اور چار مصراعی نظم کو جس کے پہلے مصرع میں قافیہ نہیں

رباعی کہا ہے، جس کو آپ یقیناً قطعہ کہیں گے، موجودہ مطبوعہ دیوان رودکی کے بعض رباعیات کا بھی یہی حال ہے

اس قطعہ یا رباعی کو یہاں نقل کر کے میں نے یہ کہنا چاہا ہے کہ اس عہد تک میں فارسی رباعیات کے تیسرے

مصرع کا ہم قافیہ ہونا ضروری نہ تھا،

پروفیسر شیرانی صاحب نے رباعی کے متعلق اپنے مضمون تنقید شعر العجم میں جو کچھ کہا ہے، وہ محقق طوسی کی

معیار الاشعار اور مفتی سعد اللہ مرحوم کے رسالہ رباعی پر مبنی ہے، آپ نے رباعی اور چہار بیتی کے درمیان جو فرق

دکھانا چاہا ہے، وہ تمامتر غیر صحیح ہے، اہلِ عروض کے نزدیک رباعی اور چہار بیتی متحد ہیں، معیار الاشعار میں ہے

"وانچہ ازیں وزنہا مانند یک مصراع مثمن است متاخراں استعمال کمتر کنند و قدما براں شعر بیار

گفتہ اند، و ایشاں ہر مصرع را قافیہ می آوردہ اند، و آنرا بیتے می شمردہ اند، مانند رجز مشطور، یا بیتہائے

مقفّٰی از اشعار تازیاں کہ آں را مقتضے معین نباشد، و بایں سبب ترانہ را قدما چہار بیت میگرفتہ

اند، و آنرا چہار بیتی خواندہ اند، و بتازی رباعی، و در ہر چہار قافیہ آوردن لازم می شمردہ، اما

بنزدیک متاخراں چوں مربعات ایں اوزان مستعمل نیست، ایں اوزان متروک است، و ہر بیتی

ازیں ابیات مصراعے می شمرند، و رباعی را دو بیتی میخوانند، و مصراع سیم را خصی می خوانند و قافیہ

شرط نمی فہمند"

مفتی سعد اللہ صاحب اپنے رسالہ رباعی میں رقمطراز ہیں:-

"قدمائے فارس ترانہ راکہ از ہزج مربع اختراع کردہ اند چہار بیتی و رباعی می گفتند و ہر دو ہر چہار رکنی

را قافیہ لازم می شمردند، اما متاخراں شان چوں ابیات مربع ہزج نزد ایشاں متروک است ترانہ

را از مثمن قرار میدہند و ہر دو ہر چہار رکنی را مصراعے می شمرند، و مجموع را دو بیتی، و در مصرع سوم قافیہ

لازم نمی دانند و آنرا خصی نامند، لیکن نبودن قافیہ در مصرع سوم لازم نباشد بل در بعضے از رباعیات

در ہر چہار مصرع قافیہ بود"

۴۔ حکماء و صوفیہ نے اپنے اظہارِ مطالب کے لئے زیادہ تر رباعی کو کیوں اختیار کیا؟ اس سوال کے جواب میں

چند اسباب و دلائل میں نے لکھے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ وہ اسباب و دلائل منطقی نہیں، جو ہر شک و شبہہ سے پاک ہوں

بلکہ محض قیاس و ذوق پر مبنی ہیں، مثنوی کسی ایک مختصر نکتہ کے ادا کرنے کے لئے کبھی استعمال نہیں کیگئی ہو، بلکہ ہمیشہ

طویل و مسلسل قصص و مسائل کے بیان و تشریح کے کام میں آئی ہے، جیسا کہ عطار اور سنائی اور رومی وغیرہ

کے یہاں ملتی ہے، انھیں بزرگوں کو جہاں کہیں مختصر اور علٰحدہ علٰحدہ نکات کے بیان کا اتفاق ہوا ہے انھوں نے

مثنوی کے بجائے رباعی کو استعمال کیا ہے، قطعہ البتہ ایک چیز تھی، چنانچہ ابن یمین نے اس سے کام لیا ہے، مگر قطعہ

کے لئے بھی گو ضروری نہیں، مگر زیادہ تر چار پانچ چھ شعروں کا استعمال شائع تھا، جیسا کہ مشہور قطعہ گو ابن یمین کے

قطعات میں نظر آتا ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ قطعہ میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسکا کوئی جزو باقی، ناتمام یا متروک
تو نہیں ہے، کیونکہ اس میں اشعار کی تعداد مخصوص نہیں ہے، مگر رباعی میں یہ شبہہ ممکن نہیں کہ اس کے چار مصرعوں
میں کمی بیشی ممکن ہی نہیں، اسلئے یہ مختصر نکات کی حفاظت کے لئے بہترین صنفِ سخن ہے،

میرے ان دلائل و اسباب میں اصل دلیل چوتھی اور پانچویں ہے یعنی یہ کہ ترانہ، قول، چہار بیتی اور
رباعی جس نام سے اس کو پکارئے وہ اہلِ فن میں گانے کے کام میں آتی تھی، اور اس لئے صوفیہ کی مجلسِ سماع کے
لئے وہ بہترین چیز تھی،

موسیقی سے میری مراد ساز پر گانا ہے،

اقسام البحور (اقسام البحور؟) رشید الدین وطواط کے جس شعر کو میں نے اس کتاب میں نقل کیا ہے اس سے
صرف اس بات پر استدلال کیا ہے کہ بحرِ ہزج جسمیں عموماً رباعی کہی جاتی ہے، فی البدیہہ اظہارِ مطلب کے لئے استعمال
میں آتی ہے، اس شعر میں یہ وہ بات تھی جس کے بیان کی طرف دوسرے کسی صاحبِ عروض نے توجہ نہیں کی ہے اور
اس لئے رشید المتوفی ۵۷۳ھ جیسے ماہرِ فن اور قدیم شاعر و عروضی کے بیان سے فائدہ اٹھایا گیا، اور اس کے شعر کے
اس دوسرے بیان کی طرف کہ اسمیں زحافات بہت آتے ہیں اور اس سبب سے اسمیں بہت سے اوزان پیدا ہوگئے
ہیں اسلئے خاص توجہ کی ضرورت نہ تھی کہ یہ تو سب ہی عروضی لکھتے ہیں، پھر محض زحافات کا کثیر آنا یا اسکا کثیر الاوزان
ہونا رباعی کے اختیار کی وجہ نہیں بن سکتی کہ قطعات میں تو بحر کی بھی سرے سے قید نہیں، وہ ہر بحر میں ہو سکتا ہے، اس لئے
اس کی بوقلمونی اور تنوع اوزان تو رباعی سے بدرجہا زیادہ ہے،

میں نے کتبخانہ بانکی پور کی فہرست کے مطابق اس رسالہ کو رشید وطواط کی طرف منسوب کیا تھا، مگر ابھی گذشتہ
اگست میں کتبخانہ حبیب گنج (علیگڈھ) نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خان شیروانی) میں جانے کا اتفاق ہوا تو
یہ رسالہ "مونس الاحرار" نام کے ایک قدیم تذکرہ و منتخبات کے آخر میں مشہور ادیب و شاعر ادیب صابر المتوفی ۵۴۶ھ
کی طرف منسوب نظر آیا، کیا عجیب بات ہے کہ یہ دو معاصر شاعر جو ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے اور ایک دوسرے کی ہجو کر

ہے، وہ اتنی صدیوں کے بعد اس طرح متحد ہوگئے کہ اب یہ فیصلہ مشکل ہوگیا ہے، کہ یہ رسالہ اب ان دو میں سے کس کی ملکیت ہے"

۵- ندوۃ العلماء کے نسخۂ دیوان حافظ کے زمانۂ کتابت کی تعیین خط و کاغذ وغیرہ کے قیاس سے میں نہیں کر سکتا،
اسلئے اس حقیقت کا اظہار "دو تین سو برس" کے مجاز کے سوا میرے لئے ممکن نہیں،

۶- مکرمی خواجہ سلیم صاحب کو سید سلیم صاحب لکھنے میں مجھ سے غلطی ہوگئی ہوگی اور آپ اسکی تصحیح کا حق رکھتے ہیں
مجھے تو خواجہ صاحب کی ایک ہی دفعہ کی ملاقات ہوا اور لاہور آپکا گویا وطن ہے، اور اہل البیت ادری بما فیہ لیکن
کیوں صاحب! ایک منطقی یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ حضرت "سید" اور "خواجہ" کا جھگڑا ختم کیجئے، گو ایک لفظ عربی اور دوسرا
فارسی ہے، مگر معنی دونوں کے ایک ہی ہیں، والسلام "س"

خیّام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ، اور فارسی رباعی کی تاریخ، اور رباعیات خیام پر مفصل
مباحث اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ، اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل
شامل ہے، خیام کے مباحث پر بہت ہی مفصل، مکمل اور حتی المقدور محققانہ، یہ سب سے پہلی کتاب لکھی گئی ہے،
ضخامت ۵۲۰ صفحات کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ،

قیمت :- غیر مجلد - ہے

مجلد - للعہ

"منیجر"

(حاشیہ ص ۲۶۴)
بونس الاحرار اس مونس الاحرار سے جسکو محمد بدر جاجرمی نے ۷۴۱ھ میں تالیف کیا ہے، الگ ہے، یہ ایک اور مصنف نے اس زمانہ سے تخمیناً پینتیس
برس پہلے تالیف کیا ہے، اگرچہ دونوں کا موضوع یکساں ہے، عنقریب اس تذکرہ پر ایک مضمون معارف میں شائع ہوگا، "س"

کیا معیار الاشعار طوسی کی نہیں؟

فارسی و عربی علم عروض و قافیہ مین فارسی کا ایک مشہور قدیم رسالہ ہے جس کا نام معیار الاشعار ہے، ہندوستان مین اس رسالہ کی اشاعت کا فخر مولانا مفتی سعد اللہ صاحب رامپوری مرحوم المتوفی ۱۲۹۴ھ کو ہے، مرحوم نے پہلے اس رسالہ کو اپنے حواشی کے ساتھ ۱۲۶۴ھ مین مطبع علوی مین چھپوایا، اور اسکی تاریخ حسب ذیل لکھی،

ع زہے معیار اشعار مُحشّا، ۱۲۶۴ھ

اس حاشیہ مین مرحوم نے اسکی مفصل شرح لکھنے کا خیال ظاہر کیا تھا، مگر جیسا کہ میزان الافکار کے دیباچہ مین انھون نے لکھا ہے کہ اودھ کی سلطنت کی تباہی و بربادی سے جمعیت خاطر ایسی منتشر ہوئی کہ شرح کا شیرازۂ ترتیب بھی منتشر ہوگیا، بعد ازین جیسا کہ خاتمہ کتاب مین ہے، جب شارح کو فصل نہم کے شروع کرنے کے بعد حرمین شریفین کا سفر درپیش آیا تو واپسی مین عدن مین جہاز کے انتظار مین کچھ دنون توقف کا اتفاق ہوا، اور وہین ۱۰ صفر ۱۲۸۱ھ مین یہ شرح اتمام کو پہنچی اور میزان الافکار کے نام سے ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء مین مطبع نولکشور لکھنؤ مین چھپی اور شائع ہوئی،

مفتی صاحب نے اصل متن معیار الاشعار اور میزان الافکار شرح معیار الاشعار دونون مین اصل کتاب معیار الاشعار کو علامہ محقق طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کی تصنیف ظاہر فرمایا، اور اسی نسبت سے یہ زبان زد خاص و عام ہوئی، مفتی صاحب نے معیار الاشعار مطبوعہ ۱۲۶۴ھ کے خاتمہ مین اس تصنیف کا سنہ تک متعین فرما دیا،

"اما بعد این نسخۂ کامل العیار مسمی بہ معیار الاشعار در علم عروض و قوافی عربی و فارسی ریختۂ قلم جادو رقم

لہ کتابت کی غلطی سے اصل کتاب مین یکہزار و ہفتاد و یک چھپ گیا ہے، یکہزار و دوصد و ہفتاد و یک چاہئے، مطبوعہ نولکشور ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء

سلطان الحکماء المتقدمین والمتاخرین محمد بن محمد بن حسن خواجہ نصیر الدین طوسی است کہ در سن ششصد و چہل و نہ ہجری از تسویدش فارغ گردیدہ"

اس سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کے نزدیک ۶۴۹ھ مین محقق نے اس رسالہ کے مسودہ سے فرصت پائی، معلوم نہیں مفتی صاحب نے یہ تاریخ کہان پائی، عجب نہیں کہ معیار الاشعار کے اس قلمی نسخہ مین جو ان کے پاس ہو یہ لکھا ہو، پھر وہ اپنی شرح کے دیباچہ مین اپنا خیال لکھتے ہین کہ محقق طوسی نے اس رسالہ کو مسودہ ہی کی حالت مین چھوڑا اسلئے وہ اس کی دوسری تصانیف کی طرح مشہور نہ ہوا،

"مگر ظاہر چنان می نماید کہ نوبت نظر ثانی خواجہ برین کتاب نرسیدہ ولہذا مثل دیگر تصانیفش متداول درس نگردیدہ" (ص)

بہرحال یہ سب مفتی صاحب مرحوم کے قیاسات و بیانات ہین، اصل متن کتاب مین نہ تو مصنف کا نام ہے نہ سال تصنیف ہے، اسلئے محققین حال کو جو ہر اس بات مین جس کی معتبر شہادت نہ ہو، شک کی نظر سے دیکھتے ہین، اس امر مین بھی شک ہوا کہ یہ رسالہ محقق موصوف کی تصنیف بھی ہے یا نہین؛

سب سے پہلے ڈاکٹر ریو نے اپنی قابل قدر فہرست مخطوطات فارسی کتبخانہ برٹش میوزیم جلد دوم ص ۵۲۵ مین مفتی صاحب مرحوم کے بیان کو لکھکر اس کی صداقت مین شک ظاہر کیا،

"ہم کو یہ نہین بتایا گیا کہ یہ انتساب (یعنی معیار الاشعار کی تصنیف کی نسبت خواجہ محقق طوسی کی طرف) کس سند پر مبنی ہے، اس پر بھی نظر رہے کہ مجالس المومنین کے مصنف نے نصیر الدین کی تصانیف کی وسیع فہرست مین اس قسم کی کسی تصنیف کا ذکر نہین کیا ہے"

فاضل جلیل مرزا محمد بن عبد الوہاب قزوینی نے محمد بن قیس رازی کی المعجم فی معاییر اشعار العجم کی تصحیح و تحشیہ کی تقریب سے اس پر جو دیباچہ لکھا ہے، اس مین معیار الاشعار اور اسکی شرح میزان الافکار کا بھی ذکر کیا ہے اور ڈاکٹر ریو کے شک دلانے سے انھون نے بھی اس کو محقق طوسی کی تصنیف قرار دینے مین شک کیا ہے کہتے ہین

"کتاب مرغوب معیار الاشعار است در علم عروض و قوافی کہ در ۶۴۹ھ تالیف شدہ و مصنف آں معلوم نیست . . . . . . دوی این کتاب را بخواجہ نصیر الدین طوسی معروف متوفی در ۶۷۲ھ نسبت دادہ است و لیے معلوم نیست از روے چہ ماخذے "

حاشیہ میں "رجوع کنید بفہرست نسخ فارسیہ برتیس میوزیم تالیف ریو ص ۵۲۵" لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مرزا کے اشتباہ کی بنیاد ڈاکٹر ریو کی مذکورہ بالا تحریر ہے،

اب ہم کو غور کرنا ہے کہ واقعہ کیا ہے؟ کتاب خیام کی تصنیف کے وقت ایک ضمنی حاشیہ میں ہم یہاں تک ثابت کر دیا تھا کہ یہ کتاب محقق طوسی کی زندگی ہی مین لکھی جا چکی تھی، مگر اس وقت تک کوئی تحریری شہادت اس بات کی نہین ملی تھی کہ یہ محقق کی تصنیف ہے، اس لئے شک کا پردہ پوری طرح سے چاک نہ ہوا تھا، اور کسی قطعی فیصلہ سے احتراز کیا تھا، اور لکھدیا تھا کہ

"ان تاریخی قیاسات کی صورت مین خواجہ کی طرف اس تصنیف کی نسبت اسناد کی غیر موجودگی کی صورت مین مشکوک معلوم ہوتی ہے، اور اگر اسناد موجود ہوں تو ان کے اوائل عمر کی تصنیف ہوگی"

(خیام ص ۴۸۴)

خیام کی اشاعت کے بعد بحمد اللہ کہ یہ سند ہم کو مل گئی، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خواجہ محقق طوسی کی تصنیف ہے، ہمارے پہلے دعویٰ کی دلیل کہ یہ کتاب خواجہ طوسی کی زندگی مین لکھی گئی ہے حسب ذیل ہے،

معیار الاشعار کے مباحث قافیہ مین ہے:-

"و مثال تغییر ردیف بطریق بدعت آن است کہ کمال اصفہانی درین روزگار در قصیدہ کہ بعضے را از اشعار ردیف "می آمد" کردہ است، و بعضے را "می آید" آوردہ است، و مطلع قصیدہ این است:

سپیدہ دم کہ نسیم بہار می آمد نگاہ کردم و دیدم کہ یار می آمد

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ اس کتاب کی تالیف کے وقت کہا گیا ہے، کمال کا یہ قصیدہ قاضی رکن الدین

ابو العلا مسعود صاعدی اصفہانی کی مدح مین ہے، یہ صاعدی خاندان اپنے مسلسل فضل و کمال اور دنیاوی جاہ و جلال کے باعث اصفہان مین نہایت محترم تھا، اور امراء کی طرح زندگی بسر کرتا تھا، سلاطین وقت اس خاندان کے وقار کا لحاظ کرتے تھے، اور شعراء اُن کی مدح مین قصیدے لکھتے تھے، اور صلہ اور انعام پاتے تھے، کمال کی تاریخ وفات میری تحقیق مین ۶۲۵ھ ہے، (دیکھو خیام ص ۴۸۵) اور قاضی رکن مسعود صاعدی کے سیاسی حیات کا زمانہ ۶۱۵ھ سے لیکر ۶۲۲ھ تک معلوم ہوتا ہے، ۶۱۵ھ مین اصفہان پر رکن الدولہ نے قبضہ کیا تو قاضی صاحب بھاگ کر اتابک سعد زنگی کے پاس (شیراز) چلے گئے تھے (ابن خلدون ج ۵ ص ۱۱۱ مصر) سلطان جلال الدین خوارزم شاہ المقتول ۶۲۸ھ کی واپسی اصفہان کے وقت تک جو غالباً ۶۲۱ھ مین ہوئی تھی، زندہ تھے، (تاریخ گزیدہ ص ۵۰۲) قاضی صاحب خود بھی اتابک کے پاس سے شاید ۶۲۲ھ سے کچھ پہلے یا پیچھے اصفہان واپس آئے تھے، چنانچہ سلطان کی طرح قاضی صاحب کی واپسی پر بھی مبارکباد کا قصیدہ کمال کے دیوان مین ہے،

اب قاضی صاحب کی مدح میں کمال نے اپنا یہ قصیدہ شاید ۶۱۵ھ سے ۶۲۵ھ تک کے کسی زمانہ میں کہا ہوگا، خواجہ نصیر طوسی کی تاریخ ولادت ۵۹۷ھ ہے، اسلئے شاید ۶۱۵ھ میں ان کی عمر اٹھارہ برس اور ۶۲۲ھ میں ۲۵ برس ہوگی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب معیار الاشعار خواجہ محقق طوسی کی زندگی مین لکھی گئی ہے،

اب آگے بڑھئے، ابھی حال مین صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی کی الوافی بالوفیات کی پہلی جلد استانبول سے ۱۹۳۱ء مین چھپکر شائع ہوئی ہے، یہ محمد بن محمد سے محمد بن ابراہیم تک کے اشخاص کے حالات پر مشتمل ہے، صلاح الدین صفدی آٹھوین صدی ہجری کا مشہور فاضل ہے، اس کی تاریخ الوافی بالوفیات فن وفیات مین سب سے مفصل اور ضخیم تالیف ہے، اور تیس جلدون پر مشتمل ہے، مصنف کی ولادت ۶۹۷ھ مین اور وفات ۷۶۴ھ مین ہوئی ہے، یعنی خواجہ نصیر طوسی کی وفات کے پچیس برس کے بعد پیدا ہوا ہے،

صلاح الدین صفدی نے اپنی اس تاریخ مین خواجہ طوسی کا پورا حال کہین ایک اور کہین دو واسطون سے نقل کیا ہے، اسی ضمن مین اس کی تصنیفات کی فہرست بھی دی ہے، جس مین فارسی رسالۂ عروض کی بھی تصریح ہے، صفدی کا بیان ہے

ومن تصانیفه التجرید فی المنطق	اور اس کی تصنیفات مین تجرید منطق مین اور
واوصاف الاشراف وقواعد العقائد	اوصاف الاشراف اور قواعد العقائد اور تلخیص
والتلخیص فی علم الکلام والعروض	علم کلام مین اور عروض فارسی زبان
بالفارسیة......	مین......

اب یہ بات کہ یہ رسالہ معیار الاشعار ہی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ دسوین صدی کے ایک مصنف فخری بن محمد امیری نے بھی جو ارغون شاہ حاکم سندھ (۹۲۸ھ تا ۹۶۲ھ) کا معاصر تھا اپنی کتاب صنائع الحسن مین جسکا نسخہ بانکی پور لائبریری مین ہے معیار الاشعار کو خواجہ نصیر طوسی کی تالیف بتایا ہے، (فہرست کتبخانۂ مذکور جلد نہم ص ۹۵۶)

ڈاکٹر ریو کا یہ کہنا کہ قاضی شوستری نے مجالس المومنین مین اس کی فہرست تصانیف مین رسالۂ عروض کا ذکر نہین کیا ہے، صحیح ہے، لیکن یہ صحیح نہین ہے کہ مجالس المومنین کے مصنف نے خواجہ کی تصنیفات کی پوری اور مفصل فہرست دی ہے، معلوم ہونا چاہئے کہ قاضی شوستری جو جہانگیر کے عہد کے آدمی ہین، خواجہ نصیر طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کے باب مین کوئی سند نہین رکھتے، قاضی صاحب نے خواجہ کی کل تصنیفات کا احاطہ نہین کیا ہے، بلکہ تصریح کی ہے کہ بعض تصنیفات کے نام لکھتا ہون، پھر یہ کہ قاضی صاحب نے اپنے موضوع کے لحاظ سے زیادہ تر مذہبی اثر کی کتابون کی طرف توجہ کافی سمجھی ہے، چنانچہ خواجہ کی تصنیفات کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہین،

وتصانیف علیہ حضرت خواجہ در علوم حکمیہ وکلامیہ وفقہیہ در مذہب شیعہ امامیہ بسیار است، از انجملہ کتاب تجرید در کلام وکتاب تجرید در منطق......" (مجالس المومنین ص ۳۴۱ ایران)

اس سے ثابت ہوگا کہ قاضی شوستری کو خواجہ طوسی کی کل تصانیف کے نامون کا احاطہ اور استقصا منظور نہ تھا،

مفتی سعد اللہ صاحب مرحوم کے اس بیان کی تصدیق کے لئے کہ خواجہ نے معیار الاشعار کا مسودہ ۶۴۹ھ مین تمام کیا، کوئی تاریخی سند ہم کو نہین معلوم، بلکہ جیسا کہ ہم نے شروع مین لکھا ہے، قیاس یہ ہے کہ یہ ۶۲۲ھ کے قریب کسی زمانہ مین لکھی گئی ہے، واللہ اعلم،

"س"

کیا اُردو زبان ہماری قومی زبان ہو سکتی ہے؟

از

ڈاکٹر ایس - این، اے، جعفری، ایل ایل ڈی، بار ایٹ لا،)

اردو زبان فی الحقیقت تین زبانوں کا مجموعہ ہے، مثل شہد کی مکھی کے صدیوں کی محنت سے بھاشا، فارسی اور عربی کے پھولوں سے رس چوس چوس کر اس نے وہ شیرینی ہمارے لئے مہیا کی ہے جس پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے، اس کے ذریعہ سے جہاں ہم پپیہے کی کوکو سنتے ہیں وہیں "نالۂ بلبل شیدا" بھی گوش زد کرتے ہیں جہاں دجلہ وفرات کی سیر کرتے ہیں وہیں سنگم کا سماں بھی دیکھتے ہیں جس طرح کنول کے پھول ہماری آنکھوں کو لبھاتے ہیں اسی طرح نرگس ونسترن ہمارے دماغ کو طراوت بخشتے ہیں، جہاں اس کے ذریعہ سے دوپٹہ اور قمیص ہماری نگاہوں کو پیام شوق دیتے ہیں وہیں ساری کی دلفریب پھبن قلب کو اکساتی ہے، اگر ایک طرف مرو اور شیراز کے خیابستان ہمارے لئے باعث کیف بنتے ہیں، تو دوسری طرف دہابن کا جوبن ہمیں سرمست بنا دیتا ہے، جہاں شیرین فرہاد کے قصے ہم میں عشق ومحبت کے جذبات پیدا کرتے ہیں وہیں نل اور دمینتی کے افسانے ہم میں پریم کی لہریں دوڑاتے ہیں، اگر ایک طرف ہم میں اس کے ذریعہ سے وہ ہندی تخیل پیدا ہوتا ہے، جس سے فلسفہ کا ادراک نشو ونما پاتا ہے تو دوسری طرف وہ عسکریت اور عملیت پیدا ہوتی ہے جو عرب کی کارواں نواز خاک کا خاصہ ہے، اگر ایک طرف ہم گلزار عدن کی سیر کرتے ہیں تو دوسری طرف ہم گنگ دیس کے شاداب سبزہ زار دیکھتے ہیں، اگر ایک طرف کشمیر کی پہاڑیاں اور کشمیر کی گلکاریاں ہمیں بے چین کرتی ہیں تو دوسری طرف شام کی "زلف عنبریں" ہمیں بزم فطرت کی رنگ آرائیوں سے آشنا کرتی ہے، اگر ایک طرف اس کے ذریعہ سے ہم کوروں اور پانڈوؤں کے کرتب دیکھتے ہیں تو دوسری طرف خالد جانباز کے کارنامے ہم میں ایثار اور بہادری کے سچے جذبات پیدا کرتے ہیں، غرض مختلف تمدنوں

کے اتحاد سے جو لطائف اور دل آویز بندشیں اُس نے پیدا کی ہیں، وہ ہماری روزمرہ زندگی میں ایک عجیب [illegible] پیدا کر دیتی ہیں، اور اگر ہم پوری طرح اس فضا سے لطف اندوز ہونا سیکھ لیں تو وہ انتشار انگیز صورتیں جو آج پیدا [illegible] ہیں، دور ہو سکتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ آپس کے نفاق اور مختلف اقوام کی عصبیت نے اس میں ایسے عوارض پیدا کر دیئے ہیں کہ اب اردو کے لالے پڑ رہے ہیں، کوئی زبان کی خدمت اسکو سمجھ رہا ہے کہ اسے عربی فارسی کے غیر [illegible] الفاظ سے بھر دیا جائے، کوئی سنسکرت کے ایسے الفاظ سے جن کا بار یہ نازک البیلی زبان نہیں اٹھا سکتی اس کو بوجھل کرنا چاہتا ہے، اس کشمکش میں دونوں طرف سے جو نمونے پیش ہو رہے ہیں وہ زبان کے لطف اور اس کی شیرینی کو مٹا رہے ہیں، ذرا ملاحظہ ہو، ایک صاحب فرماتے ہیں:۔

دودِ آہ دم سوزاں کا چراغاں ہونا ہے مرا صرف، تماشائے گلستاں ہونا

دوسری طرف ایک صاحب فرماتے ہیں:۔

"یہ منشیہ پرانی کے نئے اسنچو ہے اور نہ یہ برداں میں دے سکتا ہوں، دوسرا کوئی برمانگ لے"

اس طرز نگارش میں یہاں تک جولانی دکھائی گئی ہے کہ صرف بڑے بڑے الفاظ کا بھر دینا بلاغت اور فصاحت دونوں سمجھا گیا ہے، خواہ عبارت سے معنی بھی پیدا ہوں یا نہیں، چنانچہ صدہا اسی قسم کے اشعار جاری ہیں اور صدہا اسی قسم کے اشعار مشاعروں میں پڑھے جاتے ہیں جنکو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ بالکل بے معنی اور مہمل ہوتے ہیں، بہت سے لوگ فارسی اور عربی کے الفاظ اس زمانے میں غالب کے تتبع میں اپنے اشعار میں لاتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ غالب کا صحیح تتبع کر رہے ہیں، لیکن شاید انھیں وہ واقعہ یاد نہیں کہ غالب کی ابتدائی مشق کے دنوں میں جب وہ اسد تخلص کرتے تھے، ایک ہم عصر نے اسد تخلص رکھا اور یہ مطلع کہا،

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

تو غالب نے جھنجھلا کے اپنا تخلص تبدیل کر دیا، اگر آج مرزا نوشہ زندہ ہوتے اور اپنے تتبع میں ایسے لایعنی اشعار سنتے جنکا نمونہ اوپر درج ہوا ہے، تو شاید شاعری ہی ترک کر دیتے،

اس میں شبہ نہیں کہ خود غالب کے بعض اشعار ایسے ہیں جو فارسیت کے عیب سے پاک نہیں کیے جا سکتے، لیکن اول تو وہ اُس دور کے ہیں جب زبان پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی، دوسرے خود مرزا غالب کبھی ان پر فخر نہیں کرتے، تیسرے گو زبان کے لحاظ سے شعروں میں مشکل گوئی کا عیب ہے تاہم تخیل یا معنی کی کوئی خامی نہیں دکھائی جا سکتی، فی الحقیقت غالب کو بھی اپنی دشوار گوئی کا احساس تھا، جیسا کہ ایک جگہ کہا ہے،

ہے بسکہ کلام میرا مشکل لے دل سُن سُن کے اُسے سخنوران کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

بہر حال جب ہم اپنے ملک کی انتشاری حالت کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری حالت وہ ہو گئی کہ جتنے منھ اتنی ہی زبانیں، علم تمدن کا مسلّم مسئلہ ہے کہ قومیت پیدا کرنے میں جو چیز سب سے زیادہ معین و مددگار رہی، وہ زبان ہے اور جب تک کسی ملک کی زبان ایک نہ ہو وطنیت اور قومیت کا خیال محض خواب ہے، ہندوستان میں یہ اصول اسلئے اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ بدنصیبی سے دو اور چیزیں جو جذبۂ قومیت پیدا کرتی ہیں، ابھی تک سرے سے ناپید ہی ہیں، یعنی یکجائی خورد و نوش اور آپس کے شادی بیاہ، اس لئے ہمیں صرف زبان کی امداد پر بھروسہ کرنا ہے اور اپنی ساری کوششیں اس غرض مبذول کر دینی ہیں کہ سارا ملک "یک زبان" ہو جائے،

ہماری یہ کوششیں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتیں، اگر ہم اردو سے مغائرت برتیں، ہمارے ملک میں کوئی ایسی زبان نہیں جو اس ملک کی بڑی بڑی قوموں کے تمدنوں کی آئینہ دار ہو، ملک نے جو اور زبانیں پیدا کی ہیں وہ سب مقامی حیثیت رکھتی ہیں، ہندی کے لئے یہ دعویٰ کرنا کہ وہ ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے بالکل عبث ہے، اس زبان کو آج بھی بہی کھاتے کی زبان ماننا پڑیگا، اس کا تخیل محدود ہے اور اس میں متعدد تمدنوں کی لطافت اور شیرینی بھی شامل نہیں ہے، بلکہ ابھی تک اس کے اشعار وغیرہ میں اس سادہ اور غیر ارتقائی زندگی کا اثر ہے، جو صحیح آغازِ تمدن سے پہلے تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ زبان رسیلی ہے، لیکن سچ پوچھو تو

اس کے رسیلے پن سے متاثر ہونے میں یہ نکتہ ہے کہ ہمارے دماغوں پر تمدن کے تمام ارتقائی مدارج کا ابھی اثر اتنا گہرا نہیں ہوا ہے کہ تمدنی زندگی کا نقشہ اس غیر ارتقائی زندگی کے نقشہ پر غالب آجائے، دوسری بات یہ ہے کہ انسان میں یہ ایک جذبہ عام ہے کہ وہ قدیم چیزوں کو ہمیشہ اچھا سمجھتا ہے، اور اُن کی خوبیوں پر مبالغہ آمیز نظر ڈالتا ہے، خاصکر اہل ہند اس میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، یہ عیب بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ ہم ارتقاء سے ابھی ہم عنان نہیں ہوئے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جماعت کو ہندی کا روز افزوں شوق ہوتا جارہا ہے اور اس شوق سے ان کو تسکین حاصل ہوتی ہے، یہ بھی اسی جذبہ کے تحت میں ہے اس میں کچھ عصبیت کا بھی شائبہ ہے جو صرف زبان ہی میں نہیں بلکہ اور تمدنوں کو قبول نہ کرنے کے جذبہ میں بھی ظاہر ہوتا ہے

اب رہی انگریزی زبان، یہ موجودہ حکام کے ساتھ اس ملک میں آئی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ڈیڑھ سو برس میں اسکا یہاں بہت کچھ عمل دخل ہوگیا ہے، اور ہم نے بہت کچھ اس کے ذریعہ سیکھا بھی لیکن یاد رہے کہ یہ زبان ہماری ملکی زبان نہیں ہو سکتی ہم اس میں اپنا تخیل قائم نہیں کر سکتے ہم اُسے اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنا سکتے کچھ خانساماں اور منشی جو گوروں کی صحبت میں زیادہ تر رہتے ہیں اور ہر وقت اُن کے رعب داب سے متاثر رہتے ہیں، وہ شاید خواب انگریزی میں دیکھتے ہوں، لیکن بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ ابھی اپنا غیر ارادی خیال اسی زبان میں قائم کرتا ہے جس کے گہوارے میں وہ پلا ہے، یہی نہیں آپ غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ ہم میں سے بڑے سے بڑا انگریزی داں کبھی کسی خیال کو انگریزی میں ظاہر کرنا چاہتا ہے، تو وہ خیال پہلے اس کے دماغ میں انگریزی میں نہیں آتا بلکہ اسی زبان میں آتا ہے جس میں اسکے بچپن کا نشو و نما ہوا ہے،

مذکورۂ بالا سطور سے صاف ظاہر ہوگیا ہوگا کہ اگر ہم تمام تعصبات سے علحدہ ہو کر صرف اپنے ملک اور اپنی قومیت کے ارتقا کا خیال کریں تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہمارے ملک کی واحد زبان ہو سکتی ہے، جو ہندوستانی زبان کہلانے کی مستحق ہے اور جس کے ذریعہ سے ہم اپنے ملک میں سچی یکجہتی اور جذبۂ ملکی پیدا کر سکتے ہیں اور مختلف قوموں کو شیر و شکر بنا کر ملک کو اعلیٰ مدارج تک پہنچانے میں ہم آہنگ بنا سکتے ہیں،

معارف :- ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر جعفری صاحب نے اردو زبان کی جس تمدنی جامعیت اور ارتقا

خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ حرف حرف صحیح ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندی کے طرفدار دلائل کے زور پر اپنے دعویٰ کی صحت کے قائل نہیں، بلکہ صرف قومی جذبات کی عصبیت ان کو اس راہ پر لیجا رہی ہے، ان کا تصور یہ ہے، کہ ہندوستان ایک خالص ہندو ملک ہے، اسلئے یہاں کے تمدن، زبان، علوم و فنون، ادبیات اور مذہب ہر چیز کو ہندو پن پر مبنی ہونا چاہئے، اس خیال میں تھوڑی سی ترمیم کر لیجائے تو یہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے، ہندوستان تنہا ہندوؤں کا ملک نہیں، بلکہ ہندو و مسلمان دونوں کا ہے، اب یہاں جو تمدن قائم ہے، اور جو زبان رائج ہے، وہ نہ تنہا ہندوؤں اور نہ تنہا مسلمان، بلکہ دونوں سے ملکر، ہندوستان میں مسلمانوں کا تمدن نہ عربی ہے، نہ فارسی ہے، نہ ترکی ہے، بلکہ ہندوستانی ہے، اسی طرح جو زبان وہ بولتے ہیں، وہ بھی عربی یا فارسی یا ترکی نہیں بلکہ ہندوستانی ہے، اس زبان کو بیرونی یا بدیسی زبان سمجھنا تمامتر بے بنیاد ہے،

اردو وہ ہندی زبان ہے جس میں مسلمانوں کے مذہبی اصطلاحات، قومی خصوصیات اور تمدنی الفاظ مل گئے ہیں، اور یہ عناصر جب تک مسلمان مسلمان ہیں، اس زبان سے الگ نہیں کئے جا سکتے، مسلمان مجبور ہیں کہ وہ ایمان، کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ، خیرات، خدا، رسول، قیامت، دوزخ، بہشت وغیرہ سیکڑوں مذہبی الفاظ کو بولیں، اسی طرح کرتہ، پائجامہ، عبا، صدری، چادر، قالین، تکیہ، غلاف، غسلخانہ، پاخانہ، باورچیخانہ اور سیکڑوں مصطلحات تمدنی و معاشرتی کو جنکا بدل ہندی میں نہیں استعمال کریں، اور جب یہ الفاظ ہندی میں شامل ہونگے، تو لامحالہ اردو بنجائیگی، اسلئے مسلمانوں سے اردو کو ترک کرانے کی کوشش گویا ان کو ان کے مذہب اور تمدن و معاشرت سے محروم کرنا ہے،

ہمارے نزدیک غلط فہمی کا ایک بڑا سبب لفظ اردو بھی ہے، جو انگریزوں کے زمانہ میں اسقدر پھیل گیا ہے، کہ اب وہ ایک مخصوص زبان کا نام بن گیا ہے، حالانکہ شروع شروع میں اضافی ترکیب کیساتھ یعنی زبان اردو یا زبان اردوے معلی، اس کو کبھی کبھی کہا گیا تھا جس سے مقصود یہ تھا کہ شاہجہاں کے پایۂ تخت کی زبان، پھر رفتہ رفتہ انگریزی عہد میں یہ اضافی ترکیب مٹ کر لفظ اردو، زبان کا نام بنگیا، حالانکہ اس کے

لئے صحیح نام ہندوستانی ہے، ہندوستان اِس ملک کا نام مسلمانوں کے آنے کے بعد ہوا ہے، اس لئے لفظ ہندوستان میں ہندویت اور اسلامیت کا مشترک مفہوم شامل ہے، اور اس لئے اس زبان کا بہترین نام ہندوستانی ہے، یہ خیال بھی غلط ہے کہ لفظ ہندوستانی انگریزوں کا رکھا ہوا نام ہے، تاریخوں میں اس سے بہت پہلے بابر اور سلاطین بیجاپور کے زمانہ میں اس کو ہندوستانی کہا گیا ہے اگر ہمارے ہندو بھائی اردو کو ہندوستانی زبان سمجھیں تو ان کو اس زبان سے پھر اتنی کدورت باقی نہ رہے،

ابھی حال میں ڈاکٹر سر سپرو نے اردو، ہندی، ہندوستانی پر جو مختصر مضمون لکھا ہے، اگر ہندو مسلمان اس کی سچائی کو تسلیم کرلیں تو یہ مناقشہ دم کے دم میں ختم ہوجاتا ہے،

ہندوستانی زبان (اردو زبان) نے بہت سے ہندی الفاظ کو قبول کرلیا ہو، لیکن زبان کے ارتقائی اصول کی بنا پر ہر زمانہ میں الفاظ میں کانٹ چھانٹ اور تراش خراش ہوتی رہتی ہے، ہندی لفظوں میں بھی تھوڑی ترمیم کرکے اس نے ہندوستانی لفظ بنالیا ہے، ہندو دوست یہ چاہتے ہیں، کہ ان لفظوں کو بھی خالص ہندی تلفظ کے مطابق بولا جائے، اور اس طرح زمانہ کے سیکڑوں ہچکولوں کے بعد جس لفظ نے فصاحت کا موجودہ لباس پہنا ہے اس کو اتار کر پھر وہی پرانا کپڑا اس کے بدن پر ڈال دیا جائے، انگریزی زبان نے ہزاروں الفاظ لاطینی سے لئے ہیں، مگر انگریزی میں ان کی لاطینی شکل بعینہ باقی نہیں رہی ہے، خود ہندی میں سنسکرت کے جو الفاظ ہیں وہ بعینہ سنسکرت تلفظ و لب و لہجہ میں باقی نہیں ہیں، پھر یہ کیا دھاندلی ہے، کہ ہندوستانی نے ہندی کے جن لفظوں میں فصاحت کے تقاضے سے ترمیم کی ہو، انکو مٹاکر پھر انکو اصلی ہندی شکل میں لکھا اور بولا جائے، راون کو راونڑ، برہمن کو برہمنڑ بولنا اور اسپر اصرار کرنا زبان کی خوبی کو ستیاناس کرنا ہے، ہماری زبان میں پانی کا لفظ نہ عربی ہے نہ فارسی ہے، نہ ترکی ہے، خالص ہندی ہے، اب اس کو چھوڑ کر جل بولنے پر ضد کرنا کس مصلحت پر مبنی ہے؟ اسی طرح امید کے معنی میں ہم بولتے رہیں، لیکن اب اس کے بجائے آشا بولنے پر مجبور کرنا کیا زبان کی خدمت ہے؟ اسی کا نام اردو کو ہندی بنانا ہے،

مسلمانوں کے چند مخصوص اوقاف

از مولٰنا عبدالسلام ندوی،

عیسائی فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے تبلیغ عیسائیت کے سلسلے میں جو عظیم الشان تمدنی کام انجام دیئے ہیں ان کی نظیر مسلمان نہیں پیش کرسکتے، عام تعلیم کے علاوہ مختلف قسم کے زرعی و صنعتی مدارس، یتیم خانے، اور جذامیوں کے شفاخانے وغیرہ جو عیسائیوں نے اس وقت دنیا میں قائم کر رکھے ہیں، دنیاے اسلام میں ان کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، لیکن یہ جو کچھ ہے، مسلمانوں کی سیاسی قوت کے ضعف کا نتیجہ ہے، ورنہ اُن کے دور ترقی میں جبکہ ان کی سیاسی قوت میں کسی قسم کا زوال نہیں آیا تھا، ہر مشہور شہر میں شفاخانے قائم تھے، اور جذامیوں، دیوانوں، اپاہجوں اور اندھوں کے رہنے سہنے کے لئے مکانات بنے ہوئے تھے اور اُن سب پر اوقاف کئے گئے تھے،

دمشق شام میں پاگلوں، مجذوبوں اور جذامیوں کے مکانات کے علاوہ حیوانات کے لئے بھی وقف کئے گئے تھے، کہا جاتا ہے کہ مرجہ دمشق جو آج کل اہل شہر کی سیرگاہ ہے ان گھوڑوں کے لئے وقف تھا جو جہاد میں تھک کر بے کار ہو جاتے تھے۔

شفاخانوں میں بعض وظائف ایسے تھے کہ باوجود اس ترفہ اور ترقی کے آج تک یورپ کا ذہن بھی انکی طرف منتقل نہ ہو سکا، چنانچہ بعض ادیبوں کا بیان ہے، کہ نورالدین زنگی نے جو شفاخانہ قائم کیا تھا، اُس میں ایک وظیفہ اس غرض سے مقرر تھا کہ دو آدمی مریض کے پاس کھڑے ہو کر اُس کے مرض کے متعلق باہم اس طرح سوال و جواب کریں، کہ مریض کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ قصدًا ایسا کر رہے ہیں، چنانچہ ایک دوسرے سے اس مرض کے سبب کی حقیقت دریافت کرتا تھا، دوسرا اس کا جواب دیتا تھا، کہ مرض کوئی خطرناک نہیں، طبیب نے اس کے لئے فلاں فلاں دوائیں تجویز کی ہیں اور اس کا خیال ہے کہ صحت میں اتنے زمانے سے زیادہ دیر نہ لگیگی، اسی قسم کی اور

بھی بہت سی باتیں کرتے تھے، اور جب ایک پریشان خاطر مریض ان کو سنکر صحیح باور کرتا تھا، تو اس کے نشاط اور قوت قلب میں مؤثر دواؤں سے زیادہ اضافہ ہوجاتا تھا، بالخصوص عصبی مزاج کے لوگوں کے لئے اس قسم کی گفتگو اور بھی زیادہ مؤثر ہوتی تھی،

مسلمانوں کے رقیق ولطیف جذبات کا اظہار دمشق کے ایک اور وقف سے ہوتا ہے، جسکا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے، یعنی ایک مکان میں بہت سے بڑے بڑے چینی کے برتن لوگوں نے اس غرض سے وقف کر رکھے تھے کہ اگر کسی غلام سے اپنے آقا کا برتن ٹوٹ جائے، اور وہ اسکا مورد عتاب ہو تو وہ وہاں جاکر ٹوٹا ہوا برتن رکھدے اور اس کے عوض صحیح برتن لائے، کیا آج یورپ کے ارباب خیر اس قسم کے لطافت جذبات کی مثال پیش کر سکتے ہیں،

گرمیوں میں ایک وقف مسافروں کے لئے تھا جس کے ذریعہ سے اُن کو برف کا شربت پلایا جاتا تھا،

حوران میں احمد پاشا کی ایک زمین جذامیوں کے لئے وقف تھی،

مکہ معظمہ میں متعدد اوقاف تھے، ایک وقف اس غرض سے کیا گیا تھا کہ اسکے منافع سے مکہ میں کتوں کا آنا بند کیا جائے،

ایک وقف شادیوں اور تقریبوں میں زیورات اور سامان آرایش کے مستعار دینے کے لئے کیا گیا تھا اور عوام فقراء بلکہ متوسط طبقہ کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، اور شادیوں اور جلسوں میں جن زیورات کی ضرورت ہوتی تھی، اُن کو مستعار لیکر پھر واپس کر آتے تھے، اس طرح ایک محتاج شخص اپنی شادی میں عمدہ لباس پہن سکتا تھا، متوسط درجہ کے لوگوں کو بھی ان سامانوں کے خریدنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، جن کی وہ استطاعت نہیں رکھتے تھے،

ایک اور وقف سامان سفر اور دعوتوں اور جلسوں میں فرش وغیرہ کے مستعار دینے کیلئے کیا گیا تھا

مصر میں ایک وقف یتیموں کے رہنے، اور ایک وقف محتاجوں کے بچوں کے لباس اور ایک وقف کتوں کے کھانے کے لئے موجود تھا،

تونس خضرا میں ایک وقف ہے جسکا منافع یتیم بچوں اور غریبوں کی لڑکیوں کے نکاح پر صرف ہوتا ہے، ایک وقف بچوں کی حوصلہ افزائی اور تفریح خاطر کیلئے تھا، ایک مخصوص دن یعنی جمعرات کے روز یہ بچے جمع ہوتے ہیں اور ہفتہ بھر کا پڑھا ہوا سناتے ہیں، اس کے بعد ان کو چند درہم دیئے جاتے ہیں، تاکہ ان کا حوصلہ بڑھے،

ایک وقف اس غرض سے کیا گیا ہے کہ محتاج لوگ مفت حمام کرسکیں، اس کی صورت یہ ہے کہ حمام میں درہم کی چند تھیلیاں، جن میں ہر تھیلی میں اس قدر رقم ہوتی ہو جسکی حمام کی اجرت کے لئے ضرورت ہوتی ہے، رکھدی جاتی ہیں، ایک غریب حمام میں داخل ہوتا ہے تو ایک تھیلی اٹھالیتا ہے، اور اس کو اجرت میں دیکر حمام کرلیتا ہے، ایک وقف جذامیوں اور اپاہجوں کے لئے ہے، اور پہلے وقف کے علاوہ ایک اور وقف دوشیزہ اور قابل نکاح لڑکیوں کے نکاح کے لئے ہے، ایک وقف محتاجوں کے لڑکوں کے ختنہ کے لئے ہے جس کے ذریعہ سے اسکو ختنہ کے وقت لباس اور درہم دیئے جاتے ہیں، ایک وقف ہے جسکے منافع سے رمضان میں مفت مٹھائی تقسیم ہوتی ہے، دمشق کی طرح تونس میں بھی ایک وقف اس غرض سے کیا گیا ہے، کہ اگر کسی شخص کے ہاتھ سے برتن ٹوٹ جائے تو وہ وہاں جاکر اس کے عوض دوسرا صحیح وسالم برتن لے لے، اسی قسم کا ایک وقف فاس میں بھی ہے،

سال کے بعض دنوں میں تونس کے ساحلوں پر ایک قسم کی مچھلیاں نہایت کثرت سے آتی ہیں، اسی غرض سے ایک وقف کیا گیا ہے، کہ اس کے منافع سے یہ مچھلیاں خرید کر غریبوں کو تقسیم کیجائیں،

فاس میں ایک وقف اس غرض سے قائم ہے، کہ اگر کسی کے اوپر تیل گر جائے یا اس کے کپڑے میں کوئی چیز لگ جائے تو وہ اس وقف سے دوسرا کپڑا خرید سکے، فاس میں سیدی ابی العباس سبتی نے اندھوں اور اپاہجوں کیلئے ایک وقف کیا ہے، جس کے منافع سے ان کو روزانہ کھانے پینے کا سامان مل جاتا ہے،

ایک وقف کا نام وقف سیدی علی ابی طالب ہے، جسکا منافع مصیبت زدہ لوگوں پر صرف کیا جاتا ہے، فاس میں ایک اور وقف راستوں سے کنکر، پتھر کے ہٹانے کے لیے ہے،

ایک وقف ان موذنوں کے لیے ہے جو رات کو باری باری جاگتے ہیں، اور نرم آواز میں ایک گھنٹہ

ایک تسبیح پڑھتے ہیں، ان مؤذنوں کو مونس الغربا، یا مونس المرضیٰ کہتے ہیں، کیونکہ مریض کو نیند نہیں آتی اور ہر وقت
کوئی شخص اس کے لئے بیدار نہیں رہ سکتا، اسلئے اس مؤذن سے بہتر اسکا کوئی رفیق نہیں، دمشق کی طرح مراکش
میں بھی گرمیوں کے موسم میں ٹھنڈا پانی پلانے کے لئے ایک وقف ہے،

ایک عمارت کا نام دارالدقہ ہے، جس پر بہت سے اوقاف ہیں، یہ عمارت اس غرض سے قائم
کی گئی ہے، کہ جن عورتوں کو اپنے شوہر سے ناراضی پیدا ہو جائے وہ وہاں جا کر قیام کریں، انکا کھانا پینا
یہانتک کہ اس ناراضی کا خاتمہ ہو جائے،

مراکش میں ایک مکان ہے جسکا نام سیدی فرج ہے اس پر بہت سے اوقاف ہیں، یہ مجذوبوں اور
اپاہجوں کا ٹھکانا ہے، ان سے غریبوں کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا جاتا ہے، اور غریبوں کو جاڑے کی ابتدا میں
ان اوقاف کے منافع سے کپڑا تقسیم کیا جاتا ہے،

دو فرنچ سیاحوں کا جنھوں نے مراکش کا سفر کیا ہے، بیان ہے، کہ مراکش میں ایک عمارت ہے جو اس قدر
بڑی ہے کہ اسکو ایک شہر کہا جا سکتا ہے، اور تمام دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں، اس میں چھ ہزار اندھے رہتے ہیں
اور سوتے، کھاتے پیتے اور پڑھتے ہیں، اور اُن کے لئے خاص نظام و قوانین موجود ہیں،

مسلمانوں کے کارخیر کی یہ مثالیں ہیں، اور یورپ نے اگرچہ انتہائی تمدنی ترقیاں کر لی ہیں، اور انسانی
مصائب کے دور کرنے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتا ہے، تاہم وہ بھی اس قسم کی مثالیں قائم نہ کر سکا، ان میں بہت
سے اوقاف مٹ گئے ہیں، یا اُن کے متولی خود اُن کو اپنے تصرف میں لاتے ہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں
آتا کہ اسلام کی ترقی کے زمانے میں اس قسم کے آثار خیر موجود نہ ہوں،[1]

[1] حاضر العالم الاسلامی جلد ۱ صفحہ ۲۹۰-۲۹۱-۲۹۲، امیر شکیب ارسلان نے اس کتاب پر جو حواشی لکھے ہیں، یہ مضمون
انھی سے ماخوذ ہے،

ابن الہیثم اور علم مناظر

از

جناب محمد ذکی الدین ایم - ایس - سی (علیگ) علیگڈھ یونیورسٹی اکمیس فزکس ریسرچ اسکالر الگزنڈر
ون ہمبولڈت اسٹفٹنگ اسکالر برلن (جرمنی)

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو،
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

ابو علی الحسن ابن الحسن ابن الہیثم ۹۶۵ء میں بصرہ میں پیدا ہوا، عمر کا زیادہ حصہ مصر میں خلیفہ الحاکم کیساتھ
بسر کیا اور قاہرہ میں ۱۰۳۹ء میں وفات پائی،

موجودہ سائنس اور علم مناظر اس کے احسانات کو آجتک نہیں بھولا، اوسکی کتابیں آج تک وقعت کی نظر
سے دیکھی جاتی ہین، اور انھیں کا اثر یورپ کے مشہور سائنس دان بیکن اور کیپلر پر پڑا، یورپ کی قدردانی کا اندازہ
اس سے ہو سکتا ہے کہ گرچہ حکیم موصوف کی کتابیں عربی زبان کے سوا مشرق کی دوسری زبانون مین ترجمہ نہیں کیگئیں
لیکن فرانسیسی، جرمن اور دوسری مغربی زبانون مین اُس کی تصانیف کا ذکر بکثرت آتا ہے اور کئی مستند ترجمے بھی موجود ہیں،

ابن الہیثم کو مختلف علوم و فنون میں کمال تھا، علم ہیئت، طب، ریاضی پر عبور رکھتا تھا، اور ارسطو اور
جالینوس کی کتابون کی شرحین لکھتا تھا، مختلف مسائل پر اہم مضامین لکھے جو آج تک موجودہ سائنسدانوں اور ریاضی
دانون کو انگشت بدنداں کئے ہوئے ہیں، اس کی زندگی کے واقعات میں سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے
علمی تجر کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر عالم جذب اور وارفتگی کا بہانہ کر کے متمدن دنیا سے کنارہ کش ہو کر علوم و فنون کی

ترقی میں اپنا بیش بہا وقت صرف کیا کرتا تھا، مختلف اہم رسائل کے علاوہ اُس نے وقتاً فوقتاً دوسرے مسائل پر
وقت صرف کیا، جنمیں قابل الذکر مسئلہ دریائے نیل پر بند باندھنے کا کام تھا،

اس کی تصانیف کی فہرست سارٹن نے اپنی کتاب ہسٹری آف سائنس حصہ اول میں صفحہ ۷۲۱ پر دی ہے
اور بروکلمین نے بھی HANDBUCH DER ARABISCHEN LITERATUR میں ان رسائل کا ذکر کیا ہے
جو ابن الہیثم نے اپنے بعد ہم لوگون کے لئے بطور یادگار چھوڑے، ان رسائل میں قابل الذکر ان کی مشہور و معروف
تصنیف کتاب المناظر ہے، کتاب المناظر کی شرحین وقتاً فوقتاً لکھی گئی ہیں جنمیں کمال الدین کی تنقیح المناظر خاص اہمیت
رکھتی ہے، اس کتاب کو عربی زبان میں جناب عنایت احمد نقوی صاحب نے پانچ سال کی محنت شاقہ کے بعد علی گڑھ میں
مرتب کیا، اس کے نسخے گرچہ مختلف کتبخانوں میں موجود ہیں مگر ان میں کوئی بھی قابل وثوق و صحیح نہیں، اس کتاب کو
مرتب کرنے کے بعد اس کو جرمنی روانہ کیا گیا، اور وہان سے مشہور مستشرق پروفیسر ڈاکٹر کرانکو کے ایک دیباچہ کے
اضافہ کے ساتھ ہندوستان واپس آئی، اور دار الترجمہ، حیدر آباد دکن، سے شائع ہوئی،

اس کتاب میں مختلف مضامین ومسائل کے متعلق بحث کیگئی ہے، مثلاً روشنی کا انعکاس کس طرح ہوتا ہے؟
آنکھ کی ساخت کیا ہے؟ سورج و چاند افق پر بڑے کیوں نظر آتے ہیں؟ تارے کیوں جھلملاتے ہیں؟
انسان کو ایک آنکھ کے بجائے دو آنکھیں کیوں عطا کی گئی ہیں؟ یہ اور اسی طرح دیگر سوالات کے جوابات
اس کتاب میں موجود ہیں،

ابن الہیثم کی کتاب المناظر کا ترجمہ بیسل مین ۱۵۷۲ء میں شائع ہوا تھا، اس کے ساتھ وٹیلو کی کتاب المناظر کا
ترجمہ بھی شامل ہے، اس کی دو تصاویر پیش کر رہا ہون، ان تصاویر میں سے ایک میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نور کی شعاعیں
کس طرح منعکس ہو کر آفتاب سے ہماری آنکھوں تک پہنچتی ہیں، اس سے یہ بھی واضح ہے کہ نور کی شعاعیں خط مستقیم
میں سفر کرتی ہیں اور ہماری آنکھون میں داخل ہو کر ہمیں ضیا کا احساس دیتی ہیں، اس میں یہ بھی دکھایا ہے کہ ایک شے
میں عکس کس طرح نظر آتا ہے، اور پانی کے اندر کی چیزیں بڑی کیوں معلوم ہوتی ہیں، دوسری تصویر آنکھ کی ساخت

متعلق ہے، غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ آج بھی ہمارا علم اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ابن الہیثم کے مشاہدے اور نظریے
قابل قدر اور اہم ہیں، چونکہ یہ دونوں تصاویر معدوم ہو گئی ہیں، اسلئے ان کی اشاعت ضروری سمجھکر پیش کرنے کی جرأت
کر رہا ہون، سارٹن نے تقریباً سو مضامین کا حوالہ دیا ہے جو مختلف زبانون میں شائع ہوئے ہیں، ان کی فہرست ہسٹری
آف سائنس حصہ اول میں موجود ہے جن صاحبان کو ابن الہیثم کی تحقیقات سے دلچسپی ہو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیں

اس کتاب کے متعلق ذکر کرنے کے بعد ضروری ہے کہ ان دیگر مسائل کا بھی ذکر کر دیا جائے جنکے متعلق اس نے
خامہ زنی کی ہے، ان سب سے اہم اور دلچسپ اس کا عملی طریقہ ہے جس کی مدد سے نور کے متعلق اس نے تحقیقات کیں،
وہ اپنے علم کو مشاہدے پر قائم کرتا تھا، کسی مسئلہ کے متعلق جو نور سے تعلق رکھتا تھا پہلے عملی طریقہ اختیار کرتا اور
بعدہ جو نتائج یا مشاہدے ہوتے ان کو من وعن بیان کرتا، مثلاً آئینوں کے متعلق جو تحقیقات اُس نے کیں انکی
بنا مشاہدہ ہی تھی،

اگر آپ کسی اندھیرے کمرہ میں ایک سوراخ کریں جس سے روشنی کا گذر ہو تو وہاں دیوار پر اس کا عکس پڑیگا
اور اس عکس میں آپ کو بیرونی اشیا کی تصاویر الٹی نظر آئیں گی، اس کو "کمرہ البکیورا" کہتے ہیں، اسی مشاہدہ کا نتیجہ وہ
فوٹو کرہ ہے جس سے آج لوگ عکس کشی کرتے ہیں، ابن الہیثم نے اسکا مشاہدہ پہلے پہل کیا اور اس کا استعمال اوس
نے سب سے اول کیا،

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ارد گرد ہوا موجود ہے، اگر اوپر کی طرف کسی طیارے میں بیٹھکر سفر کریں تو ایک
ایسے مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں کہ ہوا مفقود ہو گی، ابن الہیثم نے ہوا کی اونچائی معلوم کرنے کی پہلی کوشش کی،

ابن الہیثم کا نظریہ نور جس کے متعلق اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ تھا کہ شعاعیں آنکھ تک پہنچکر ہمیں نور کے متعلق خبر
دیتی ہیں، یہ نظریہ اس زمانے میں بالکل انوکھا نظریہ نظر آتا تھا اس لئے کہ بطلیموس اور دیگر حکمائے یونان کے نظریون
کے روسے روشنی کی ماہیت بالکل جداگانہ خیال کیجاتی تھی،

ان مسائل کے علاوہ جنکا مختصر ذکر مندرجۂ بالا سطور میں کیا گیا ہے، اور جنکے تحقیقات سے علم مناظر آج اس

درجۂ کمال پر پہنچا ہے، ابن الہیثم نے ریاضی کے متعدد اہم مسائل حل کئے، اور اپنے فہم و ادراک کا ثبوت دیا،

اس سلسلہ میں قابلِ ذکر امر یہ بھی ہے کہ حکماے یونان اور ابن الہیثم کے درمیان علم المناظر کے متعلق معلومات کی کڑی گم ہوگئی تھی، مگر چند ماہ کا ذکر ہے کہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں الکندی کا ایک رسالہ جس میں نگ... کے متعلق بحث کی گئی ہے، دستیاب ہوا، اس کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے اور عنقریب شائع ہونے والا ہے، اس کے بعد ... بھی یہ خبر ملی کہ قسطنطنیہ میں کندی کے پندرہ رسائل ملے ہیں، ان میں سے بعض علم مناظر کے متعلق ہیں، چنانچہ قسطنطنیہ ... سے بھی اس رسالے کی نقل منگوائی گئی ہے، اور اسکو بھی ترجمہ کرتے وقت استعمال کیا گیا ہے،

ان رسائل کے دریافت ہونے کی وجہ سے امید کیجاتی ہے کہ حکماے یونان اور ابن الہیثم کے درمیان جو گمشدہ کڑیاں ہیں وہ مکمل ہو جائینگی اور ایک مکمل تاریخ علم مناظر شائع کیجا سکے گی، انشاءاللہ المستعان،

شعاعوں کا انعکاس کسطرح ہوتا ہے،

آنکھ کا نقشہ

تلخیص و تبصرہ
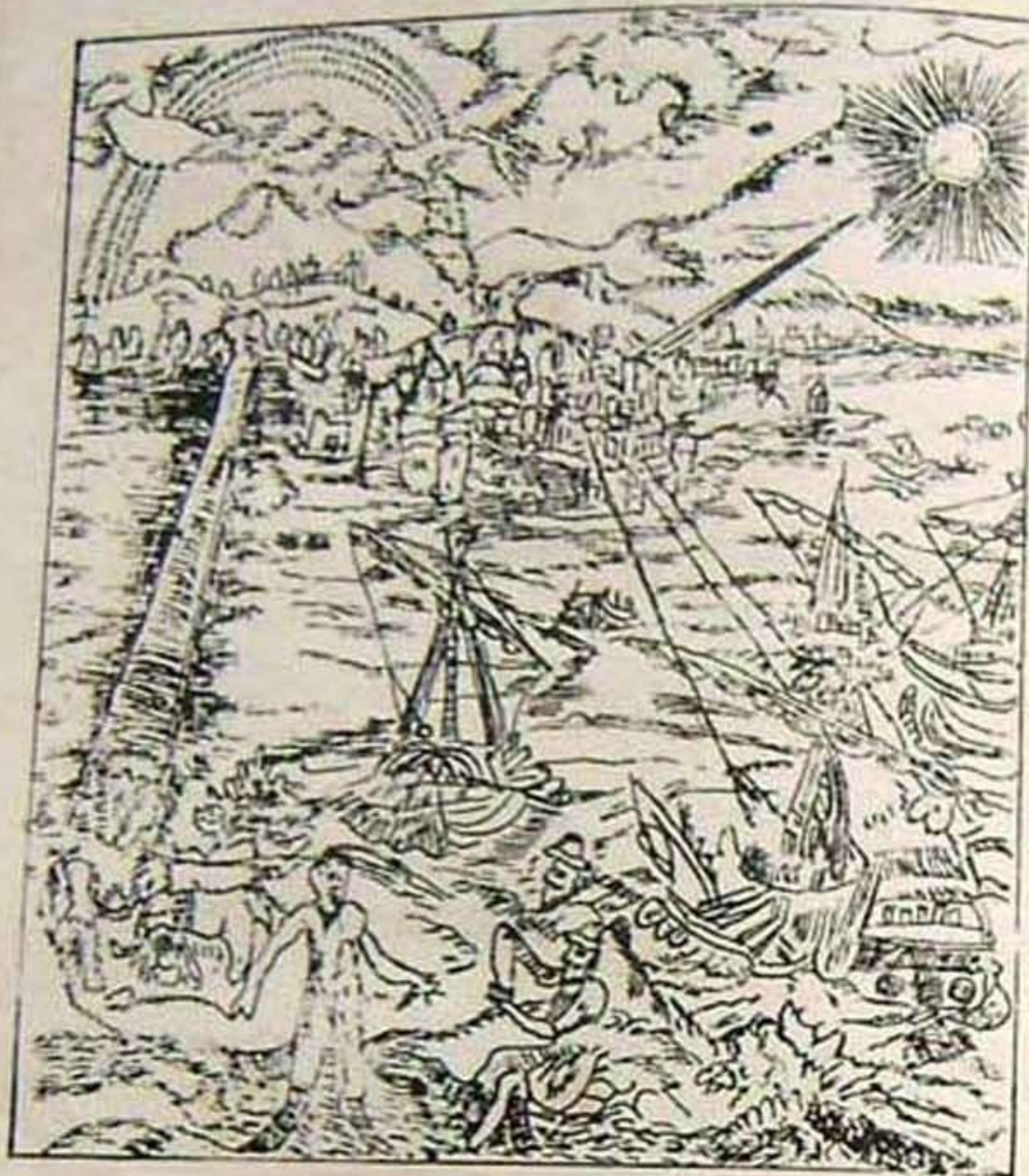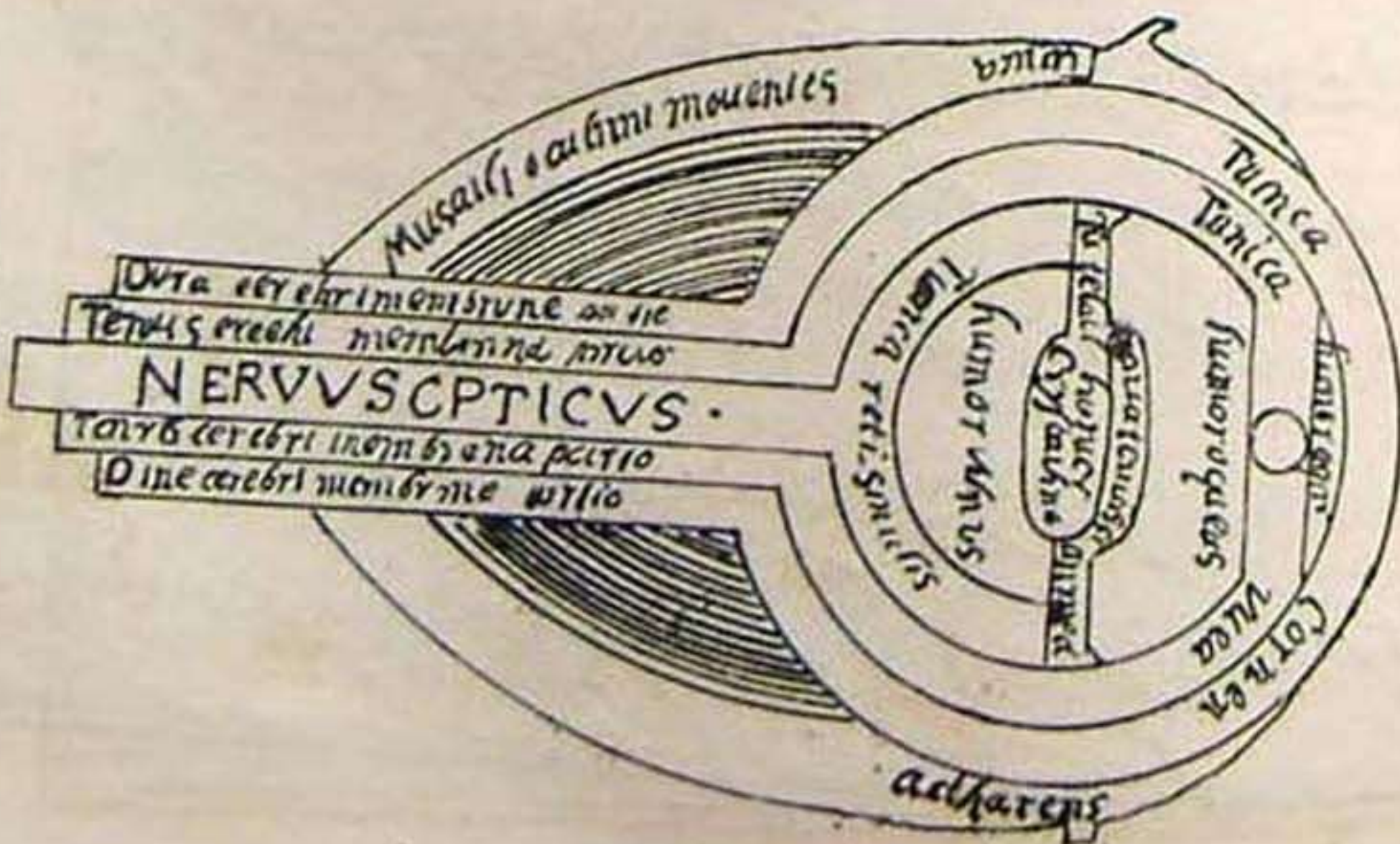
تغیر پذیر جاپان،

جاپان کے ممتاز مصنف یوسوک زورومی (Yusuke Tsurumi) کا ایک مضمون عنوانِ بالا سے حال میں برطانوی روزنامہ "ڈیلی ٹیلی گراف" میں شائع ہوا تھا، جو سنڈے اسٹیٹسمین مورخہ ۱۶ ستمبر ۳۴ء میں نقل ہو کر آیا ہے، صاحب مقالہ نے اہل جاپان کے قومی خصائل وضاحت کیساتھ بیان کئے ہیں، اور پھر اُن تغیرات کو دکھایا ہے جو مغرب کے تعلقات سے قومی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں رونما ہو رہے ہیں، ناظرین معارف کی دلچسپی کے لئے ہم اس مضمون کا ملخص ترجمہ سطور ذیل میں اس غرض سے پیش کرتے ہیں، تاکہ ہم کو معلوم ہو کہ اپنے قومی خصوصیات کو باقی رکھنے کیساتھ بھی مشرقی قومیں، مغربی اقوام کی برابری کر سکتی ہیں،

"جو لوگ جاپان کے کسی مشہور باغ کی سیر کرینگے انھیں اہل جاپان کے قومی خصائل کا نشان مل جائے گا" باغ کے درختوں اور مصنوعی پہاڑیوں کے درمیان سیر کرتے ہوئے انھیں سب سے پہلے وہاں کی فضا میں سکون و قناعت کا ایک عجیب احساس ہوگا، باغ کے حد درجہ خوبصورت ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن درختوں اور پھولوں کی خوبصورتی کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے جو اس احساس کی محرک ہوتی ہے، سکون و خاموشی کی جو فضا وہاں پھیلی ہوئی ہے، وہ حقیقۃً اُس کامل ہم آہنگی کی پیدا کردہ ہے جس سے باغ کا چپہ چپہ معمور ہے، پھر یہ ہم آہنگی محض باغ ہی تک محدود نہیں، بلکہ اس کی وسعت میں گرد و پیش کے مناظر بھی شامل ہیں، باغ کے تمام درخت، پہاڑیاں اور چبوترے اس طرح ترتیب دیئے گئے ہیں کہ قریب کے جنگلوں اور دور کی پہاڑیوں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا

ہو جائے، ہم آہنگی ہی میں حُسن پایا جاتا ہے اور حسن ہی میں امن و سکون ملتا ہے، ہر شے کل کا ایک جزو ہے اور جزو کا فرض یہ ہے کہ اپنے کو اس طرح ترتیب دے کہ کل میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے،

ہم آہنگی کا یہ احساس اہلِ جاپان کی فطرت میں راسخ ہے، یہ چیز ہماری فطرت کا ایک جزو ہو گئی ہے، کسی بات کو کہتے یا کرتے وقت ہمارے ذہن میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اثر خاندان کے دیگر افراد یا جمہور پر کیا پڑیگا، یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ ایثار و قربانی کو انسان کا سب سے بڑا وصف شمار کرتے ہیں،

ہم آہنگی کے اس شغف سے دو خصوصیتیں اور پیدا ہوئیں، سادگی اور اعتدال، ہم آہنگی کے حصول کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ رنگ و وضع کے علاوہ خیال میں بھی سادگی پیدا کیجائے، یہ چیز کسی جاپانی گھر میں داخل ہو کر خوب سمجھ میں آجاتی ہے، جہاں حسن مذاق کا معیار یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جس قدر کم چیزیں سامنے رکھی جائیں اتنا ہی بہتر ہے، بادی النظر میں کمرہ تقریباً خالی معلوم ہوگا، لیکن غور سے دیکھنے والا اس کاوش کو معلوم کرے گا، جو گھر کی مالکہ نے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے چیزوں کے رنگ و وضع کی ترتیب میں برتی ہے، سادگی کا یہ ذوق جاپانی خیالات میں بھی خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے، چنانچہ ہندوستان اور چین کے پیچیدہ فلسفے جب جاپان میں لائے گئے تو انھیں بہت نمایاں طور پر سادہ بنا لیا گیا،

ہم آہنگی کے حصول کا بہترین ذریعہ اعتدال ہے، لیکن اہلِ جاپان نے جب اس اعتدال کو گفتگو میں ظاہر کیا تو حد سے متجاوز ہو گئے اور یہیں سے ایک دوسری قومی خصوصیت پیدا ہو گئی، یعنی کم گوئی، ہم لوگ کم بولنے والے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بعض اوقات کم گوئی کے اس وصف نے بین الاقوامی مجمعوں میں عجیب دشواریاں پیدا کر دیں،

اہلِ جاپان فطرۃً بہت زیادہ جذباتی اور ذکی الحس ہوتے ہیں، لیکن صدیوں کی فوجی تعلیم نے ان میں احتیاط اور ضبطِ نفس کی شدید عادت پیدا کر دی ہے، جس طرح مجمع عام میں کپڑے اُتارنا معیوب خیال کیا جاتا ہے اسی طرح ایک تعلیم یافتہ شخص کے لئے ہم لوگ اسے بھی نازیبا سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے عریاں جذبات دوسروں پر ظاہر کرے،

ذکی الحس ہونے کی وجہ سے ہم لوگ خارجی تبدیلیوں کو جلد قبول کرتے ہیں، اس سے ہم میں زمانہ کا ساتھ دینے کی قوت پیدا ہو گئی ہے جس کے باعث ہم پر اکثر نقالی کا الزام لگایا جاتا ہے، لیکن یہ نقالی یا تتبع میرے خیال میں اسی احترام کا اظہار ہے، جو اہلِ جاپان غیر ملکی تمدنوں کا کرتے ہیں، ہم غیر ملکی تمدنوں کی بہتر خوبیوں کا اعتراف کرنے اور انھیں اپنے ہاں رائج کرنے میں کبھی نہیں شرمائے،

ہماری جذباتی اور ذکی الحس فطرت فلسفۂ مابعد الطبیعیات کے نشو و نما میں معین نہ ہو سکی، جس میں ہمارے ہمسایہ اہلِ چین اور ہند و ممتاز تھے، ہم اہلِ جاپان ایک عملی قوم ہیں اور فکر و تخیل میں ہماری دستگاہ کچھ زیادہ نہیں ہے، فکر اور عمل کی وحدت کا خیال ہماری فطرت میں اتنی گہرائی کے ساتھ داخل ہے کہ ہم کسی شے کو علم سمجھتے ہی نہیں، جب تک اُسے عمل میں بھی نہ لائیں، اسی چیز نے خیالی فلسفہ میں ہماری ترقی محدود کر دی،

جاپانی قوم کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت مناظرِ قدرت سے شیفتگی ہے، اگر آپ کسی ابتدائی مدرسہ کے بچوں سے کوئی مضمون لکھنے کو کہیں اور موضوع کا انتخاب خود انھی کی پسند پر چھوڑ دیں تو سو میں پچانوے بچے مناظرِ قدرت پر مضمون لکھینگے، آپ غریب سے غریب کاشتکار یا مزدور کے گھر میں بھی ایک گلدستہ یا مناظرِ قدرت کی کوئی تصویر پائیں گے،

اسی جذباتی فطرت کی بنا پر ہم دولت سے زیادہ عزت کی قدر کرتے ہیں، ہم لوگوں میں سلطنت کا تخیل ملک کے تخیل کی ترقی یافتہ شکل نہیں ہے، بلکہ اسکا ارتقا، خاندان کے تخیل کے ساتھ ہوا ہے، سلطنت خاندان ہی کی ایک وسیع شکل ہے، اس معنی میں اس کے تمام باشندے ایک ہی خاندان کے افراد ہیں جسکا مرکز خاندان شاہی تھا، اسی سبب سے ہمارے دلوں میں خاندان شاہی کا احترام غیر محدود ہے، شہنشاہ اور سلطنت کیساتھ وفاداری میں استوار رہنا قوم کا سب سے بڑا وصف خیال کیا جاتا ہے،

حال کی جڑیں ماضی کی گہرائیوں میں نصب ہیں، اس تاریخی واقعہ نے کہ جاپان پر کبھی کسی غیر قوم نے حملہ نہیں کیا، اور گذشتہ صدی کے وسط سے پہلے دو صدیوں دوسرے ملکوں سے الگ تھلگ رہا، ہم میں

اس بات کا بہت زیادہ احساس پیدا کر دیا کہ ہماری نسل اور ہماری سلطنت دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے، یہ چیز بہتیرے جاپانیوں کے لئے ایک ذہنی روک ثابت ہوئی، لیکن ساتھ ہی ساتھ قومی طاقت کا ایک سبب بھی بنگئی،

اہل جاپان فطرۃً مذہبی ہیں، تہذیب جدید اپنی نصف صدی کی اثر اندازی سے بھی ایک سپاہی یا کسان کی سادہ اور پر عقیدت فطرت کو یکسر بدل نہ سکی، قوم کی اکثریت اپنے معاشرتی نظام میں اب بھی قدیم جاپان کے روایتی تمدن پر بدستور قائم ہے،

تاہم ہر جگہ صنعت وحرفت اور مغربیت کا اثر محسوس کیا جارہا ہے، آبادی کی کثرت سے اقتصادی حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ قوم کی نفسیات میں بھی تغیر واقع ہو رہا ہے، صحافت سینما، لاسلکی، مغربی کھیلوں اور عہد جدید کی دوسری ایجادوں کے اثر سے اس تغیر کی رفتار اور زیادہ تیز ہو رہی ہے، اور اسمیں کوئی شبہہ نہیں کہ قومی سیرت میں ایک خاموش مگر مستقل تبدیلی پیدا ہو رہی ہے،

صنعت وحرفت اور بیرونی تجارت کی ترقی سے قوم کے مطمحِ نظر کا ایک عالمگیر وسعت اختیار کرلینا ناگزیر ہے، ایک ایسی قوم کے خصائل جس کے ننانوے فی صدی بچے مدرسوں میں تعلیم پا رہے ہیں، اسی مقام پر قائم نہیں رہ سکتے جہاں وہ اس وقت تھے، جب کہ اس قوم کی صنعت زراعت تھی اور اس کی حکومت ایک جاگیر داری حکومت تھی، جس طرح سیاسی اور معاشرتی حیثیت سے یہ وقت جاپان کے لئے ایک اہم با شان فیصلہ کا وقت ہے، اسی طرح نفسیاتی حیثیت سے بھی یہ وقت اس کے لئے ایسا ہی اہم ہے، "ع ز"

منطق پر ایک قدیم عربی تصنیف

منطق پر خالص عربی تصنیفات میں سے ایک تصنیف جو قرون وسطیٰ میں بہت مقبول تھی آج صرف لاطینی ترجمہ میں محفوظ ہے، اسکا لاطینی عنوان Liber Introductorius in Artem Logicae Demonstrationis

ہے، (جسکا اردو ترجمہ یہ ہوگا:۔ کتاب جو ہمیں استدلال اور تشریح کا فن سکھاتی ہے) اس پر مصنف کا نام محمد درج ہے، جو الکندی کا شاگرد تھا، یہ سوال کئی بار اٹھ چکا ہے کہ یہ محمد کون تھا، دو مشہور فاضل جو الکندی (متوفی [illegible]) کے حقیقی شاگرد تھے، السرخی (متوفی ۸۹۹ء) اور منصور بن طلحہ بن طاہر تھے، لیکن ان میں سے کسی کا نام محمد نہ تھا، پہلے کا نام احمد بن محمد تھا، اس پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ لاطینی مترجم نے ترجمہ کرتے وقت نام کا پہلا ٹکڑا غلطی سے چھوڑ دیا یا بعد میں کسی کاتب کی غلطی سے پہلا ٹکڑا چھوٹ گیا، بہرحال اس عہد میں متعدد فلاسفہ ایسے تھے جنکا نام محمد تھا اور جو حقیقۃً الکندی کے شاگرد ہو سکتے تھے، ان میں سے ایک محمد بن موسیٰ بن شاکر اور دوسرا اسکا ہم عصر محمد بن الہثم تھا اور یہ دونوں منطقی تھے،

ڈاکٹر البینو ناگی (ALBINO NAGY) جنھوں نے "LIBERINTRODUCTORIUS" کا لاطینی نسخہ اڈٹ کیا ہے یہ رائے رکھتے تھے کہ یہ محمد حقیقۃً الفارابی (متوفی ۹۵۰ء) تھا، جہانتک دونوں کے زمانوں کا تعلق ہے، "معلمِ ثانی" کا الکندی کا شاگرد ہونا ممکن نہیں ہے، تاہم جس زمانہ میں الفارابی بغداد میں یوحنا بن خیلان سے منطق پڑھتا تھا وہ الکندی کی مصنفات بھی مطالعہ میں رکھتا تھا، اس بنا پر ایک وسیع معنی میں اسے الکندی کا شاگرد کہہ سکتے ہیں، ابن رشد بھی بظاہر اسی کتاب کا ذکر کرتا ہے اور اُسے الفارابی کی طرف منسوب کرتا ہے، علاوہ بریں "LIBERINTRODUCTORIUS" کے مصنف نے جن متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے، اُن سب کے عنوانات وہی ہیں جو الفارابی کی مصنفہ یا منسوبہ کتابوں کے ہیں، الفارابی کی تصنیفات منطق میں سے کئی ایک کے عربی عنوانات بظاہر LIBERINTRODUCTORIUS سے ملتے جلتے ہیں، مثلاً کتاب التوطیہ فی المنطق، فصول یحتاج الیہا فی صناعۃ المنطق، اور کتاب المدخل الی المنطق، ان میں سے پہلی کتاب عبرانی ترجمہ میں محفوظ ہے، دوسری عربی زبان (عبرانی رسم خط) میں، لیکن تیسری مفقود ہے، پہلی دونوں کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی "LEBERINTRODUCTORIUS" نہیں ہو سکتی، لہذا اگر یہ کتاب دراصل فارابی ہی کی تصنیف ہے، تو پھر یہ اس کی گمشدہ کتاب، کتاب المدخل ہی ہے،

برخلاف اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ اسکا مصنف کوئی اور ہو، اس کتاب کا متن تقریباً لفظ بلفظ اخوان الصفا کے مشہور رسائل میں ملتا ہے، پس کوئی وجہ نہیں کہ اس کی تصنیف محمد بن معشر البستی کی طرف جسے کبھی کبھی المقدسی بھی کہتے ہیں منسوب نہ کیجائے، محمد بن معشر ان مشہور و معروف رسائل کے مصنفوں میں سے تھا، یہ رسائل یورپ اسپین میں بہت مشہور تھے، جہاں ان کی ترویج ابوالقاسم مسلمۃ المجریطی (متوفی ۳۹۸ھ) کی طرف منسوب کیجاتی ہے، بوڈلین لائبریری، اکسفرڈ میں رسائل کے دو قلمی نسخے موجود ہیں، جنپر اسکا نام ہے،

اصلی عربی عبارت تیرھویں رسالہ میں پائی جاتی ہے، جسکا عنوان یہ ہے:۔

"فی انولوطیقا الثانیۃ فی المنطق - اسکا ایک ٹکڑا جسمیں موسیقی کا ذکر ہے حسب ذیل ہے:۔

"ومثال ذلک من الروحانی والنفسانی وھو قولنا الغناء اشارۃ الی الحان مؤلفۃ واللحن مؤلف من نغمات متناسبۃ وابیات موزونۃ والابیات مؤلفات من المفاعیل والمفاعیل من الاوتاد والاسباب وکل واحد ایضا مؤلف من حروف متحرکات وسواکن وانما یعرف ھذہ الاشیاء صاحب العروض ومن ینظر فی النسب الموسیقیۃ"

اسی ٹکڑے کا خلاصہ پندرھویں رسالہ موسومہ فی الموسیقی کی فصل بہ عنوان فی اصول الالحان و قوانینھا میں بھی ہے،

منطق کی اس تصنیف کا مصنف علاوہ اُن کتابوں کے جنکا ذکر اوپر ہوچکا ہے اور جو الفارابی کی تصنیف ہیں اپنے دیگر اسناد کا حوالہ نہیں دیتا اور محض اہل یونان سے استفادہ کا ایک اجمالی اعتراف کرتا ہے، ڈی بوئر (T.J. DE BOER) کی رائے ہے کہ اگرچہ اخوان الصفا سے فلسفۂ ارسطو کی خالص اور کامل ترین شکل کا سراغ نہیں ملتا جو الکندی سے شروع ہوتی ہے، تاہم یہ ناممکن نہیں ہے کہ وہ لوگ الکندی اور اس کے اسکول سے علمی تعلقات رکھتے تھے، اس سلسلہ میں ایک امر قابل توجہ یہ ہے کہ اخوان الصفا اپنے رسالہ فی المنطق

میں انسان کے مزاج و سرشت پر فلکی اثرات سے متعلق ٹھیک وہی غلطی کرتے ہیں جو الکندی اپنے رسالہ فی اجزاء خبریۃ الموسیقی میں کرتا ہے، پس اخوان نے یا تو الکندی سے نقل کیا ہے یا پھر اُن سب نے کسی ایک ہی ماخذ سے لیا ہے،

(جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن) "ع۔ ز"

امن کی ایک جدید تحریک،

گذشتہ جنگ عظیم کی تباہ کاریاں یورپ کی پشت نخوت کے لئے ایک نہایت ہی سخت تازیانہ تھیں جس کے چرچے امن کی پکار سے پورا براعظم گونج اٹھا تقریباً ہر ملک میں امن کی تحریک باقاعدہ طور پر شروع کردی گئی اور اس مقصد کیلئے مختلف انجمنیں قائم ہو گئیں لیکن طاقت کا نشہ وہ نشہ ہے جسکا خمار کبھی پوری طرح نہیں اترتا، چنانچہ وہی آثار و علامات جو گذشتہ جنگ سے پیشتر نظر آرہے تھے اب پھر بعض دوربین نگاہوں کی تشویش کا باعث ہورہے ہیں، ان خطرات کا اندازہ کرتے ہوئے رسالہ لٹریری ڈائجسٹ (امریکہ) کے ایک مقالہ نگار نے ایک جدید تحریک امن شروع کرنی چاہی ہے، موصوف کا خیال ہے کہ موجودہ نسل کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ انجیل کے اصول از سر نو تمام دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں، صلح و امن کی امید صرف اُسی وقت کیجاسکتی ہے جب اسکی خواہش دل کی گہرائی سے پیدا ہو، اس مقصد کے حصول کیلئے اُسنے حسب ذیل پانچ دفعات کا ایک پروگرام مرتب کیا ہے:۔

(۱) سب سے پہلے ہمیں اپنے ذہن میں امن کا تخیل راسخ کرلینا چاہئے، پھر ہمیں چاہئے کہ امن کا لٹریچر کثرت سے تقسیم کریں، بین الاقوامی صلح کے قیام کیلئے ضرورت ہے کہ جنگ کے اسباب سے واقفیت حاصل کیجائے اور اُن قوموں کے منصوبے معلوم کئے جائیں جنکی سرحدوں پر جنگ کے خطرات خفیہ طور پر اپنا کام کر رہے ہیں،

(۲) ہمیں متحد ہوکر اس بین الاقوامی مقابلہ کا انسداد کرنا چاہئے جو جنگی بیڑوں اور فوجوں کی تیاری میں ہو رہا ہے

(۳) ہمیں اس بات کیلئے بھی متحد ہوجانا چاہئے کہ جو اسلحہ غیر سرکاری طور پر مالی منفعت کی غرض سے تیار کئے جاتے ہیں اُن کی روک تھام کیجائے،

(۴) ہمیں چاہئے کہ اپنی اپنی حکومتوں پر زور ڈالکر اسلحہ کی درآمد و برآمد بالکل روک دیں، ریاستہائے متحدہ امریکہ

کے سینٹ نے یہ تجویز منظور کرلی ہے اور صدر امریکہ کو یہ اختیار دیدیا گیا ہے کہ جو قومیں جنگ پر تلی ہوئی ہیں انکے لئے امریکہ سے ... کا بھیجا جانا بند کردے، ہمیں متحد ہو کر اس اصول کو اس حد تک وسعت دینی چاہئے کہ جو قومیں جنگ کیلئے پیش قدمی کریں انھیں سرکاری یا غیر سرکاری قرضے بھی نہ دیئے جائیں،

(۵) آخر میں ہمیں پریزیڈنٹ روزولٹ (صدر امریکہ) کی اس تائید کیلئے بھی متحد ہو جانا چاہئے کہ تمام قومیں متفقہ طور پر ایک عہدنامہ پر دستخط کریں کہ جنگ میں پیش قدمی نہ کرینگی، اس قسم کے معاہدے مخالف تنقیدوں کے علی الرغم اپنا اثر ضرور رکھتے ہیں، تحریکِ امن ابھی اپنے ابتدائی مدارج میں ہے، ہر دستخط شدہ معاہدہ قوم کے ارادۂ امن کو تقویت بخشتا ہے، یہ تدبیر اسوقت تک جاری رہنی چاہئے جبتک امن قائم کرنے کا عزم جنگ برپا کرنے کی خواہش سے زیادہ مضبوط نہ ہو جائے،

مقالہ نگار کا خیال ہے کہ پانچ دفعات کا یہ پروگرام ایک ایسا پروگرام ہے جسپر ہر خیال کے لوگ بلا کسی دشواری کے متفق ہو سکتے ہیں اور جس پر عمل کرنے سے وہ عہد پورا ہو سکیگا جو آج سے بیس سال قبل جنگِ عظیم کی ابتدا میں کیا گیا تھا، یعنی جنگ کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے کا عہد،

کسی خاص پروگرام سے بڑھکر اہم اور بنیادی چیز یہ ہے کہ اخوتِ انسانی کیلئے ایک متحدہ کوشش کیجائے چنانچہ اس مقصد ... امریکہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۴ء کو "یوم اخوت" منایا گیا، اور پوری قوم کو مندرجہ ذیل اقرار و اعلان کی دعوت دی گئی

(۱) میں دوسروں کیساتھ خواہ وہ کسی نسل یا فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں وہی برتاؤ کرنا چاہتا ہوں جو میں انکی طرف سے اپنے لئے پسند کرتا ہوں

(۲) میرا عزم یہ ہے کہ حقوقِ انسانی کا احترام کروں اور ہر انسان کی نسبت اسکی ذاتی اہلیت کے مطابق رائے قائم کروں،

(۳) میں ہر اس منظم کوشش کی مخالفت کرونگا جسکا مقصد کسی مذہبی یا معاشرتی جماعت کے خلاف خوف یا نفرت کا جذبہ پیدا کرنا ہو

مذکورہ بالا اعلانات کی بابت صاحبِ مقالہ کی رائے ہے کہ یہ ایک ایسا فلسفۂ حیات ہے، جو باعتبار اپنی عمل کے ایک زریں اصولِ زندگی ہے، یہ ایک ایسا فلسفۂ حیات ہے جو تمام حقوقِ انسانی کو محیط ہے، اور جو فکر و عمل کی آزادی قائم کرنے کے لئے نسل، رنگ، اور فرقہ کی تمام حد بندیوں کو پامال کردیتا ہے،

"ع ز"

اخبارِ علمیہ

نازی جرمنی کا "آرین مغالطہ"

کچھ عرصہ سے یورپ کے علمی حلقون مین اُس برتاؤ کے خلاف جو قومی تعصب کی بنا پر جرمنی مین یہود کے ساتھ کیا جارہا ہے، نیز اون "سائنٹفک" خیالات کی نسبت جو نازیون نے اپنی جگہ قائم کرلئے ہین، ایک طرح کی برہمی پیدا ہورہی ہے، چنانچہ حال مین لندن مین ماہرینِ انسانیات و نسلیات کی جو انجمن منعقد ہوئی تھی، جسمین تمام دنیا کے مشہور سائنس دان شریک تھے، اسمین جرمنی کے اس تخیل و عمل کی مخالفت نہایت صاف الفاظ مین کی گئی، جرمنی کے بعض سیاسی لیڈرون نے نسلی عصبیت کی بنا پر "آرین" اور "غیر یہودی" کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھ رکھا ہے، لندن کی اس انجمن مین اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی گئی، اور سر گریفٹن اسمتھ (SIRGRAFTON SMITH) نے جن کا شمار برطانیہ کے اکابر علمائے انسانیات مین ہے، جرمنی کے "آرین مغالطہ" کا خاصہ مضحکہ اڑایا، نازیون کے اس خیال پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے، کہ "آرین" نسل ہر طرح کی خوبی اور بہتری کی جامع ہے، موصوف نے فرمایا:- یہ مسئلہ اب تک مختلف فیہ ہے، کہ تہذیب کی ابتدا کس مقام پر ہوئی، لیکن ہم اس امر کی شہادت رکھتے ہین، کہ خواہ اسکی ابتدا مصر، سومیریا، (سومری قوم ساکن بابل کی سرزمین) ہندوستان، یا کسی اور ملک مین ہوئی ہو، لیکن تہذیب کا کام شروع بحرِ روم ہی کی ساحلی نسل نے کیا، اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہین نکلتا کہ اُس نسل مین تہذیب و تمدن کو جاری کرنے کا کوئی خلقی ملکہ تھا، بلکہ یہ محض اون تاریخی حالات کا نتیجہ تھا، جنھون نے سواحلِ نیل کے باشندون کو ایسے مشاغل مین لگادیا، جن سے تہذیب و تمدن کی تعمیر لابدی طور پر ہونے لگی،

اس وقت جب کہ دماغ و اخلاق کی اعلیٰ خوبیان شمالی یورپ کی جرمن قومون اور نام نہاد آرین نسل کے لوگون کی طرف منسوب کیجاتی ہین، یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ آرین نسل کے موجد تہذیب ہونے کا نظریہ شبہہ سے بھی زیادہ کمزور بنیادون پر قائم ہے اور اگر آرین نسل کے لوگ قدیم کلچر کے بانی تھے، تو صرف اسی شکل مین کہ انھون نے اپنی تہذیب بابل سے اخذ کی تھی بعد پروفیسر ہالڈین (HALDANE) (لندن یونیورسٹی) نے فرمایا کہ کسی شخص کے اسلاف کی واقفیت سے خود اسکی استعداد و اہلیت پر بہت کم روشنی پڑتی ہے، جہان تک جسمانی حالات کا تعلق ہے، یورپ کے نسلی سلسلے اپنی خصوصیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے ہین، اور ظاہری شکل و صورت اب موروثی نسلی خصوصیات کی علامت نہین رہ گئی،

کامیابی کا معیار

کسی شخص کی زندگی کے ناکام یا کامیاب ہونے کے متعلق اس وقت تک فیصلہ نہین کیا جا سکتا جب تک اسکے تمام کارنامے پیش نظر نہ ہون، ابتدائی کامیابی یا ناکامیابی معیار نہین ہو سکتی، اکثر اشخاص جو اپنی طالب علمی کے زمانہ مین بہت ذہین اور تیز سمجھے جاتے تھے، فارغ ہونے کے بعد کوئی خاص امتیاز حاصل نہ کر سکے، برخلاف اس کے بہترے لوگ جو شروع مین بھدے اور غبی تھے، آگے چل کر نہایت ممتاز ثابت ہوئے، چارلس ڈارون جس کا نظریۂ ارتقاء تمام دنیا مین مشہور ہوا، اور جو اکثر حیثیتون سے ایک بڑا آدمی تھا، اپنی تعلیم کے زمانہ مین ایک نہایت معمولی طالب علم تھا، اور کسی غیر ملکی زبان پر عبور حاصل نہ کر سکا، نپولین اپنی قابلیت کے لحاظ سے ہم سبق لڑکون مین بیالیسوین نمبر پر تھا، لیکن اسکے اکتالیس ساتھیون مین سے کسی ایک کا نام بھی مدرسہ کی چہار دیواری سے نکلکر شہرت کے میدان تک نہ پہنچ سکا اسی طرح سر آئزک نیوٹن بھی اپنے درجہ مین تقریباً سب سے آخری نمبر پر تھا، اور ریاضی کا یہ شہرۂ آفاق فاضل جیومٹری مین ہمیشہ فیل ہوتا رہا، الگزانڈر فان ہمبولٹ مشہور جرمن سائنس دان بچپن مین اتنا غبی تھا، کہ اوس کے اساتذہ کو اوس کی معمولی سمجھداری مین بھی شبہہ تھا، جارج الیٹ جس کے ناول عام مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہین، اوس نے پڑھنا لکھنا بہت مشکل سے سیکھا تھا، اور اس کے متعلق یہ پیشین گوئی کی جاتی تھی، کہ وہ نہ صرف ایک بہت غبی عورت ہوگی، بلکہ

گو وہ بھی صرف موٹے موٹے کام کرنے کے قابل ہوسکیگی، سر والٹر اسکاٹ برطانیہ کا ایک ناول نگار محنت کافی کرتا تھا، مگر ذہین بالکل نہ تھا، گولڈ اسمتھ اٹھارہوین صدی کا ممتاز انگریز ادیب و تمثیل نگار اپنے ہم سبقون مین آخری نمبر پر تھا، اناطول فرانس جس کا شمار عہد جدید کے ممتاز ترین مصنفین مین ہے کبھی امتحانات مین کامیاب نہ ہو سکا، بروننگ تیس سال سے زائد مدت تک ناکامی کی زندگی بسر کرتا رہا، ابراہیم لنکن متعدد اور پیہم شکستون کے بعد ترقی کرتا ہوا دنیا کے متحدہ امریکہ کے سب سے زیادہ معزز مقام یعنی صدارت تک پہنچ سکا، لیکن اب اپنی لیاقت اور کارنامون کے لحاظ سے وہان کے بہترین صدرون مین شمار کیا جاتا ہے،

ایک جدید سائنس

ہارورڈ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر ہارلن اسٹٹسن (HARLAN I STETSON) کا خیال ہے کہ جلد ایک نئی سائنس مرتب ہو جائے گی، جس کا نام کوسمیکالوجی (COSMECOTOG V) ہوگا، اس کا مقصد ان اثرات کا مطالعہ و تفحص ہوگا جو زندگی پر مظاہر فلکی (COSMIC. PHENOMENA) سے پڑتے ہین مثلاً سطح زمین کی پیڑیون مین تبدیلیان، مد و جزر، انوار شمالی و جنوبی، فلکی اور دیگر اشعاع، نیز وہ مختلف اثرات جو فضائے آسمانی سے روئے زمین پر مترتب ہوتے ہین،

بائبل کی کثیر اشاعت

برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ سے معلوم ہوا ہے، کہ گذشتہ سال بائبل کی ۱۰۹۳۳۰۲ جلدین نکلین، جو ۱۹۳۲ء کی تعداد کے مقابلہ مین بقدر ۲۱۵،۳۴ زیادہ ہین، گذشتہ سال اس کے ترجمہ مین گیارہ نئی زبانون کا اضافہ کیا گیا، چنانچہ اب تک جتنی زبانون مین بائبل شائع کی جا چکی ہے، اُن کی مجموعی تعداد ۷۰۰ ہے،

کیمیائی تحقیقات مین اضافہ

پروفیسر کرین (E.J. CRANE) امریکہ کا بیان ہے کہ تمام دنیا مین کیمیائی تحقیقات پر روز بروز زیادہ زور دیا جارہا ہے، ۱۹۳۳ء کی پہلی ششماہی مین ۱۷۶۴۸ اور مجمل مقالات کیمیائی تحقیقات پر شائع ہوے تھے، لیکن ۱۹۳۴ء کی پہلی ششماہی مین ۱۸۶۶۴ اور مجمل مقالات دو ہزار ممتاز سائنٹفک اور ٹکنکل رسالون مین نکل چکے ہین،

ریڈیم کا نیا ذخیرہ

امریکن کیمیکل سوسائٹی کے رسالہ مین یہ اطلاع شائع ہوئی ہے، کہ بلغاریہ مین ریڈیم کا ایک نیا ذخیرہ دریافت ہوا ہے، جس کا تراسی فی صدی ریڈیم اس قابل ہے، کہ نکالا جاسکے، اس وقت ریڈیم کی قیمت تقریباً پچاس ہزار ڈالر فی گرام ہے، لیکن چند سال پیشتر اوس کی قیمت ایک لاکھ بیس ہزار ڈالر فی گرام تھی، تمام دنیا کے نفیس ریڈیم کی مجموعی مقدار تقریباً سات سو گرام ہے،

برنرڈ شا کا تازہ حملہ

حال مین برنرڈ شا کا نیا ڈرامہ "پہاڑون پر" (ON. THE ROCKS) ڈبلن مین اسٹیج کیا گیا تھا، جس سے حاضرین بہت زیادہ متاثر ہوے، اس ڈرامہ مین شا نے اپنے مخصوص طنزیہ لب ولہجہ مین سوسائٹی کے موجودہ نظام پر نہایت سخت حملے کئے ہین، اور دکھایا ہے، کہ یورپ کے نظام معاشرت کی بنیادین کس قدر کمزور اور کھوکھلی ہین،

"ع ز"

اوراق پارینہ

علامہ شبلی نعمانی کی دو غیر مطبوعہ تحریرین،

کتبخانہ رام پور سے متعلق،

از

جناب مولوی امتیاز علیخانصاحب عرشی، ناظم کتب خانہ رامپور،

یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے، کہ کتب خانہ ریاست رامپور کی بنیاد ریاست کی بنیاد کے ساتھ پڑی، لیکن نواب سید محمد یوسف علی خان بہادر کے عہد تک اس کی حیثیت پلیس لائبریری سے زیادہ نہ تھی، نواب خلد آشیان طاب ثراہ نے خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ مبذول کی، اور اپنی قدردانی، فیاضی کے طفیل تقریباً ۹ ہزار کتابون کا ذخیرہ اپنے بعد چھوڑا، یہ مارچ ۱۸۶۵ء کا واقعہ ہے، ان کے بعد نواب سید مشتاق علی خان بہادر کے عہدِ حکومت مین ریاست کے کل نظم ونسق کا تعلق مدار المہام جنرل عظیم الدین خان بہادر سے ہوگیا، جنرل صاحب موصوف نہایت روشنخیال اور اصلاح پسند طبیعت رکھتے تھے، ریاست کے دوسرے محکمون کے ساتھ ساتھ آپ نے کتبخانہ کی تنظیم وترتیب کی طرف بھی توجہ کی، اور اس سلسلہ مین علامہ شبلی مرحوم سے خواہش کیگئی کہ وہ اس بارہ مین اپنی تجاویز پیش کرین، حسنِ اتفاق سے، کتب خانہ کے ردی گھر (گودام) کا جائزہ لیتے وقت علامہ مرحوم کی پیش کردہ تجاویز کا مسودہ جو مولنا کے اپنے قلم کا تحریر کیا ہوا ہے، دستیاب ہوا، چونکہ اس مین تنظیم وترتیبِ کتب کے متعلق اہم تجاویز پائی جاتی ہین، بنابرین اس کا مطالعہ نہ صرف اس لئے کہ وہ اردو زبان کے ایک بلند پایہ ادیب و مورخ کی تحریر ہے، بلکہ علمی وفنی حیثیت سے بھی مفید ہوگا،

رپورٹ متعلق کتب خانہ ریاست عالیہ مصطفیٰ آباد رامپور

مین نے کتب خانہ سرکاری کو جو درحقیقت ریاست کی علمی فیاضیون کی ایک حیرت انگیز یادگار ہے، دو تین دن مین جس قدر تحقیق وکاوش کی نگاہ سے دیکھنا ممکن تھا، دیکھا، ایک شخص گو اس کی نظر کتنی ہی وسیع ہو، کتب خانہ کے احاطہ مین جاکر جب اُن عزیز الوجود اور بیش بہا کتابون کو دیکھیگا جن کو جستجو اور قدر دانی اور فیاضیون نے، دنیا کے مختلف حصون سے لاکر وہان جمع کر دیا ہے، تو دفعۃً وہ حیرت زدہ ہو جائیگا، لیکن اسی کے ساتھ جب وہ کتب خانہ کی بے ترتیبی اور فہرست کی ناموزونی پر نظر ڈالیگا تو سخت افسوس کریگا،

اصلاح طلب امور کو مین دفعہ وار عرض کرتا ہون، اور امید ہے کہ وہ قبول کی نگاہ سے دیکھے جائین،

دفعہ ۱۔ سب سے بڑی بے ترتیبی یہ ہے کہ کتابین الماریون مین حروفِ تہجی کی ترتیب سے رکھی گئی ہین، جسکا یہ نتیجہ ہے کہ کتاب الخراج قاضی امام ابو یوسف کو جو نہایت عالی رتبہ تصنیف ہے کلیاتِ رند کے پہلو مین جگہ دیجا سکتی ہے، کتب خانہ مین ہر موقع پر یہ ناموزونی موجود ہے، اور نہایت بدنما معلوم ہوتی ہے، مین نے بہت بڑے بڑے کتب خانے دیکھے ہین، مگر مجھکو کسی کتب خانہ مین یہ ناموزون ترتیب نہین ملی ہے، سب سے مقدم یہ ہے کہ فن اور علم کے لحاظ سے فہرست مرتب کیجائے اور پھر اُس مین حروفِ تہجی کا لحاظ ہو، فہرست کا نمونہ جو منشی امیر احمد صاحب[1] نے پیش کیا ہے نہایت عمدہ ہے، لیکن جو خانہ "مختصر خلاصہ" کا رکھا گیا ہے اور اس مین مثال کے طور پر ایک کتاب کے تمام مضامین کا خلاصہ کیا ہے، یہ طریقہ چندان ضروری نہین ہے اور نہایت مشکل ہے کہ ہر کتاب کے متعلق ایسا خلاصہ طیار ہو سکے، مین کافی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہون کہ اگر ایسا کرنا ضروری خیال کیا جائے تو ریاست کو مولوی عبد الحق صاحب[2] اور مولوی ارشاد حسین صاحب[3] کو مجبوراً تکلیف دینی پڑے گی، اس خانہ مین تصنیف کے متعلق کسی قدر حالات لکھے جائین مثلاً اگر وہ کتاب تاریخ وغیرہ کی ہو تو یہ

[1] منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مراد ہین، موصوف اس کمیٹی کے ممبر تھے، جو تنظیم کتب خانہ کے لئے مرتب کی گئی تھی، [2] مولانا عبد الحق بن مولانا فضل حق خیر آبادی مراد ہین، [3] مولانا ارشاد حسین مجددی رامپوری مراد ہین، جو خود مولانا شبلی مرحوم کے استاد تھے، (ع-ص)

لکھا جائے کہ کس عہد سے کس عہد تک کی تاریخ ہے، کس قسم کے حالات ہین، اگر ادر فن کے متعلق ہو تو مصنف یا کتاب کی نسبت کوئی تاریخی امر لکھنا کافی ہوگا، لیکن یہ التزام ضروری نہین، اور اس پر خاص توجہ کی حاجت نہین، اور التزام مین بے انتہا دقت ہوگی،

دفعہ ۲۔ فن کی ترتیب سے جو فہرست ہوگی اُس کے ذریعہ سے کتابون کا نکالنا مشکل ہوگا، اسلیے حروف تہجی کی ترتیب سے بھی ایک فہرست موجود رہے، جیسا کہ عموماً کتب خانون مین ایسی ایک فہرست مرتب ہوتی ہے، لیکن کتابون کے رکھنے مین اس فہرست کا مطلق لحاظ نہ ہو،

دفعہ ۳۔ ہر کتاب پر دو قسم کے نمبر قائم کئے جائین، ایک باعتبار فن کے، اور ایک باعتبار حرف تہجی کے لیکن فن کا نمبر اول قرار دیا جائے، مثال یہ ہے،

کتاب الخراج نمبر فن - ۳۰ نمبر حرف تہجی ۱۴۲ ،

اس طریقہ سے ہر فہرست مین دونون نمبرون کا حوالہ دیا جائے، تاکہ جو کتاب سرکار کو مطلوب ہو فوراً مل سکے اور جستجو کی زحمت نہ ہو،

دفعہ ۴۔ اکثر کتابون کے دو تین نام ہوتے ہین، ایسی صورت مین جو نام مشہور اور معروف ہے اس کو اصل قرار دینا چاہئے اور دوسرا نام بھی اس کے ساتھ لکھدیا جائے،

دفعہ ۵۔ مجموعون مین نہایت بے ترتیبی ہے، ان کی جلدین توڑ کر، یا تو ایک فن کے لحاظ سے یا مصنف کے لحاظ سے رسالے ایک مین مجلد کئے جائین، موجودہ مجموعے ایسے ہین، جو نہ ایک خاص فن مین ہین، نہ ایک مصنف کی تصنیف ہین، اس بے ترتیبی سے کتب خانہ نہایت ناموزون معلوم ہوتا ہے،

دفعہ ۶۔ جو کتابین محفوظ اور رِزرو قرار دیگئی ہین، اُن مین صرف خوشخطی اور حیثیتِ ظاہری کا لحاظ کیا گیا ہے، حالانکہ وہ کتابین دراصل رزرو قرار دیجا سکتی ہین جو عمدگی مضمون اور وقعتِ مصنف اور کمیابی کے لحاظ سے قابلِ قدر ہون، مین نے نہایت نادر الوجود کتابون کو دیکھا ہے کہ وہ عام کتابون کیساتھ

رکھی ہوئی ہین، ایسی تمام کتابین چھانٹ کر الگ کیجائین، اور ان کے لئے ایک خاص الماری ہو، مدرسۃ العلوم[1] مین اس قسم کی کتابین ایک نہایت مضبوط آہنی صندوق مین رکھی گئی ہین، لندن مین فولادی الماریان مخصوص ہوتی ہین، لیکن اس قسم کی کتابون کا انتخاب کرنا ایک مستعد اور وسیع النظر عالم کا کام ہے، اور مین علانیہ کہتا ہون کہ کتب خانہ کا موجودہ اسٹاف اس کام کے بالکل لائق نہین ہے،

دفعہ ۷- جو فہرست سردست مرتب ہے یا ہو رہی ہے، اس مین تفصیل فن کے متعلق سخت غلطیان ہین، اس سے زیادہ کیا تعجب انگیز بات ہوگی، کہ "قصہ" کو ایک فن قرار دیا گیا ہے، اور مخزن اسرار نظامی جو تصوف و اخلاق کی نہایت عمدہ تصنیف ہے، اس کو "قصہ" کے ذیل مین لکھا ہے، یہ ایک خاص مثال ہے، ایسی بہت سی مثالین ملسکتی ہین، اس پر خاص لحاظ ہونا چاہئے،

دفعہ ۸- کتابین صرف ایک لائن مین رکھی جائین، موجودہ صورت مین نہایت تکلیف ہوتی ہے، اور دوسری لاین کی کتابین جو بالکل اوٹ مین ہین، اُن کا دیکھنا متعذر ہے،

دفعہ ۹- الماریان عموماً شیشے کی ہونی چاہئین،

دفعہ ۱۰- کتب خانہ کی ایک رپورٹ مرتب کیجائے جس مین یہ مراتب ہون،

کتب[1] خانہ اولاً کس وقت قائم ہوا، ہر[2] عہد ریاست کی مخصوص ترقیان، کل[3] کتابین کس قدر ہین، قلمی کس قدر، مطبوعہ کس قدر، عمدہ کتابین باعتبار حیثیت ظاہری کے کس قدر، عمدہ کتابین باعتبار عمدگی مضمون اور کمیابی کے کس قدر، ملازمین[4] کتب خانہ کا شمار اور ان کی تنخواہین، سالانہ[5] صرف کتب خانہ، اس قسم کے اور حالات بعض حالات شاید تحقیق معلوم نہ ہوسکین، ان مین تخمینہ پر اعتماد کرنا ہوگا، یہ رپورٹ عمدہ مطلا جلد بندھکر کتب خانہ مین رکھی جاوے،

دفعہ ۱۱- پرانی جلدون کا ایک بار نیا ہو جانا ضرور ہے تاکہ سابق نقصانات کی ترقی کا رستہ بند

[1] علی گڑھ کالج مراد ہے، (عرشی)

ہوجائے اس لئے کہ گو موجودہ احتیاط اور حفاظت آیندہ نقصان پہنچنے سے مانع ہے، لیکن جن کتابون کے پشتے اور شیرازے مین کیڑا اثر کر چکا ہے ان کا بند و بست ضرور ہے، ورق گردانی سے (جسکو مین نے خود دیکھا) اس نقصان سابقہ کی ترقی کا انسداد نہین ہوسکتا، اسلئے کہ پشتہ کے اندر کا کیڑا بغیر شیرازہ کھلنے اور جلد بندھنے کے جا ہی نہین سکتا، اور یہان جو جلدین بندھا کرتی ہین اور جنکی کیفیت مجھکو دریافت ہوئی، اگر اسی پر اکتفا ہوگی تو بہت سی کتابین جبتک ان کی جلد بندھنے کی نوبت آئے ناقص تر ہو جائنگی، اس لئے جلد تر ایسی کتابون کی جلدین نئی بندھ جانا ضروری ہے اور نہایت ضرور ہے،

دفعہ ۱۲- جو کتابین خلاف تہذیب ہون، یا چھپی ہوئی کتاب کے متعدد نسخے ہون خارج کردیجائین، لیکن قلمی کتابین اس وجہ سے ہرگز نہ خارج کیجائین کہ وہ ناقص اور ناتمام ہین، ممکن ہے کہ وہ نہایت عمدہ کتابین ہون اور اسی قدر حصہ کا موجود ہونا غنیمت سمجھا جاوے، ایسی کتابین اکثر کتب خانہ مین اس وقت موجود ہین، اور موجود رہنا چاہئے، ہان جو کتابین عام اور معمولی ہین، وہ ناقص ہون تو خارج کردیجائین،

دفعہ ۱۳- اس قسم کی فہرست اور ترتیب کے لئے جو ضروری ہے اور جسکی طرف خدام والا کا خیال بھی مائل ہے، ضرور ہے کہ چند مدت کے لئے کوئی لائق اور مستعد عالم شخص مقرر کیا جائے، اور موجودہ اسٹاف اس کی نگرانی مین کام کرے، ایسے بڑے کتب خانہ کے لئے، تھوڑا سا صرف اور بھی کرنا غالباً ضرور ہے، اور نہایت ضرور ہے،

یہ مراتب مین نے کسی قدر عجلت کی حالت مین عرض کئے ہین، اگر ان امور کی نسبت مجھ سے کوئی زائد آگاہی مقصود ہوگی تو مین نہایت دلی رغبت کے ساتھ، بذریعہ تحریر کے عرض کرسکونگا،

محمد شبلی - نعمانی، عربک پروفیسر مدرسۃ العلوم علیگڈھ،

محررہ ۱۴؍ اکتوبر ۱۸۸۹ء

علامہ مرحوم کی اکثر تجاویز اصلاحات پر عمل کیا گیا، کتابین زبان، اور فن پر منقسم ہوئین، متعدد مجموعے بھی ازسرنو مرتب کئے گئے اور سرکار مرحوم نے کتاب خانہ کے لئے نئی عمارت تیار کرائی، چنانچہ ربع صدی کے

بعد مولانا آخری بار رامپور تشریف لائے، اور کتب خانہ دیکھا، تو مندرجہ تحت کیفیت معائنہ بک پر اپنے قلم سے تحریر فرمائی،

(۲)

"مین اس کتب خانہ سے بارہا متمتع ہوا ہون، ہندوستان کے کتب خانون مین اس سے بہتر کیا اس کے برابر بھی کوئی کتب خانہ نہین، مین نے روم و مصر کے کتب خانے بھی دیکھے ہین، لیکن کسی کتب خانہ کو مجموعی حیثیت سے مین نے اس سے افضل تر نہین دیکھا، اہل کاران کتب خانہ کی محنت اور وسعت اطلاع کی داد دینی چاہئے، خصوصاً مہدی علیخان صاحب[1] تو خود ایک زندہ کتب خانہ ہین"

شبلی نعمانی ۶ راپریل سنہ ۱۹۱۲ء

مکاتیب شبلی

مولانا شبلی مرحوم کے دوستون، عزیزون، شاگردون کے نام خطوط کا مجموعہ جس مین مولانا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی، اور ادبی نکات ہین، یہ درحقیقت مسلمانون کی تیس برس کی تاریخ ہے، طبع دوم، قیمت جلد اول عہ، جلد دوم عہ ضخامت حصہ اول ۲۴۹ صفحے، دوم ۲۶۱ صفحے،

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

[1] مولوی مہدی علیخان مرحوم کتب خانہ کے تحویلدار تھے، فارسی کی تعلیم باضابطہ پائی تھی، اردو مین شعر بھی کہتے تھے، اور حضرت امیر مینائی سے تلمذ تھا، موصوف کو مین نے خود دیکھا تھا، آخر عمر مین ضعف کے باعث سواری مین کتب خانہ آتے جاتے تھے، لیکن حافظہ کا یہ عالم تھا کہ کتاب کا حلیہ بتاکر الماری مین سے نکال لاتے تھے، ان کی متعدد تصنیفات کتبخانہ مین موجود ہین، "عرشی"

ادبیات

تیری آنکھین،

از پروفیسر محمد اکبر منیر ملتان،

تری آنکھون کی رعنائی مین کیا شان الٰہی ہے — قیامت کی سفیدی ہے قیامت کی سیاہی ہے
شب دیجور کی ظلمت ہے نور صبحگاہی ہے — غضب ہے ایک جا روم و حبش کی پادشاہی ہے

فرشتے برف کی چادر مین بادل رکھ کے لاتے ہین
تری پلکون کے نیچے بجلیون کو یون چھپاتے ہین

تری آنکھین شب تاریک کے روشن ستارے ہین — فضائے عالم قدسی کے بے پردہ اشارے ہین
تری زلفین تو ہین کالی گھٹا یہ برق پارے ہین — نہین، یہ آفتاب حسن کی کرنون کے آرے ہین

اتر کر دل مین پہلو کو جگر تک چیر جاتے ہین،
محبت کے لئے اک آتشی مندر بناتے ہین،

تری آنکھین بلوری جام ہین جو حکم داور سے — بھرے جبرئیل نے جنت مین جا کر حوض کوثر سے
لگائی ان مین آگ آئینہ گردون کے جوہر سے — ہوئے یہ مست شعلے اڑ کے ہم آغوش محشر سے

قیامت بھر رہی ہے تیری مستانہ نگاہون مین
پڑی ہے ایک ہلچل سی جہان کی بزمگاہون مین

تری آنکھیں کنول کے پھول ہیں جو باغِ جنت میں — کبھی مانندِ کشتی تیرتے تھے آبِ رحمت میں،

تبسم بن کے حوریں کھیلتی تھیں انکی خلوت میں — فرشتے ڈوب جاتے دیکھکر نورِ مسرت میں

بہشتی کشتیاں اب حسن کے پانی میں بہتی ہیں،

تمنا بن کے روحیں عاشقوں کی ان میں رہتی ہیں

تری آنکھیں ہیں دو چشمے شرابِ آسمانی کے — ہیں رقصاں حسن کے آئینے میں جوہر دلستانی کے

شرر افشاں ہیں جلوے ان میں حسنِ جاودانی کے — جہانِ پیر کو نغمے سناتے ہیں جوانی کے

یہ چشمے حسن کے گلزار کو سیراب کرتے ہیں،

محبت کے چمن کو خرم و شاداب کرتے ہیں

تری آنکھیں شرارِ برق ہیں گم کردہ راہوں کو — گرا کر برقِ عصمت پھونکدے میرے گناہوں کو

نگاہوں میں مری ڈال اپنی نورانی نگاہوں کو — کہ دیکھوں تیرے آئینوں میں قدسی بارگاہوں کو

مری ہستی محیطِ حسن میں مستور ہو جائے،

لگا کر نور میں غوطہ سراپا نور ہو جائے۔

سخنِ ماہر

از مولوی منظور حسین ماہر القادری، حیدر آباد دکن

ہر نفس پیغامِ بربادی ہے انسان کے لئے — نبض کی ہر موج ہے نشتر رگِ جان کے لئے

زندگی دی ہی گئی تھی، کشمکش کے واسطے — دل بنایا ہی گیا تھا سوزِ پنہاں کے لئے

اپنے اندازِ کرم کی، مجھ سے تاویلیں نہ کر — یہ بھی اک تقریب تھی جودِ فراواں کے لئے

اے مرے حسنِ عقیدت اے مرے نورِ یقین — کفر کی بھی اک جھلک تکمیلِ ایماں کے لئے

کچھ نہ پاکر بھی سمجھتا ہے کہ سب کچھ پا لیا، — زندگی سب سے بڑا دھوکا ہے انسان کے لئے

پھول، ذرے، کہکشاں، تارے، شفق، قوسِ قزح — نذر لائے ہیں ترے حسنِ فراواں کے لئے

رہ گئی ہے دولتِ ایمان و دیں ماہر کے پاس

یہ بھی حاضر ہے نگاہِ کفر ساماں کے لئے

حسنِ بیان

از شیخ عبد اللطیف صاحب تپش، ایم، اے، لکچرار ایمرسن کالج ملتان

مستِ نگہِ نرگسِ مستانہ بنا دے — لبریزِ شوق ہوں پیمانہ بنا دے،

بکھرے ہوئے یہ بال تو دیکھے نہیں جاتے — لیتا ہوں بلائیں تری دیوانہ بنا دے،

دنیا میں پھر آغاز ہے کافر منشی کا، — اچھا ہے کہ پھر کعبہ کو بتخانہ بنا دے،

محفل کا تری رنگ خدا جانے کہ کیا ہو — تقدیر اگر شمع کو پروانہ بنا دے،

ہونے کو تو سو بار ہو ہنگامۂ محشر — جذباتِ تحیر کو تماشا نہ بنا دے،

اک حرفِ تمنا ہو سنا دوں تجھے قاصد — ایسا تو نہیں بات کو افسانہ بنا دے،

لطف آئے جو یہ رنگ کی پرواز کسی دن — آئینہ کو تصویر سے بیگانہ بنا دے،

پھر توبہ کے ٹکڑوں پہ گزر ہو مری ساقی — پھر مجھ کو گدائے درِ میخانہ بنا دے،

اشکِ سرِ مژگاں کو تپش پونچھتے کیوں ہو

ممکن ہے کہ قسمت اسے دردانہ بنا دے

باب التقریظ والانتقاد

حیاتِ حافظ رحمت خان

از

سید ریاست علی ندوی،

مؤلفہ جناب سید الطاف علی بی اے علیگ بریلوی، ۳۶۸ صفحات، کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ مجلد خوبصورت، قیمت ؏ نظامی پریس بک ڈپو، بدایون،

ہندوستان کی تاریخ مین اٹھارہوین صدی مین تقریباً ایک ہی قسم کے ماحول مین دو شخصیتین دو مخالف سمتون شمال و جنوب مین پیدا ہوئین، ایک حافظ الملک حافظ رحمت خان کی، اور دوسری ٹیپو سلطان کے باپ نواب حیدر علی کی، مؤخر الذکر باپ بیٹون کو انگریزی و فرانسیسی حکومتون سے بیشتر سابقہ رہا، اس لئے ان کے سوانح حیات کے خط وخال خواہ کسی آب ورنگ مین سہی، انگریزی تاریخون مین پھر ان کے توسط سے اردو کی تاریخی ریڈرون مین بہت کچھ نظر آتے ہین، لیکن حافظ رحمت خان کا تعلق زیادہ تر دیسی ریاستون سے رہا، انگریزون سے واسطہ پڑا تو دراصل اس فیصلہ کن جنگ مین جسمین انھون نے شہادت پائی، اس لئے یہ انگریز مورخین کا مستقل موضوع نہ بن سکے، حالانکہ ان کے کارنامے اس لائق تھے کہ انگریز مورخین بھی ان سے کافی اعتنا کرتے کہ انہی کا وجود جب تک قائم رہا، انگریزون کو شمالی ہند مین اودھ سے آگے قدم بڑھانے کی جرأت نہ ہو سکی، "حیاتِ حافظ رحمت خان" کے مصنف تشکر یہ کے مستحق ہین کہ انھون نے اس تالیف کے ذریعہ نہ صرف حافظ رحمت خان کے مکمل سوانح حیات

جنگی و عمرانی خدمات، بلکہ گویا روہیلکھنڈ کی مکمل تاریخ اختصار، جامعیت، اور اچھی ترتیب، تبویب اور تحشیہ کے ساتھ پیش کی ہے،

حافظ رحمت خان کے حالات دو قسم کے ماخذون مین ملتے ہین، ایک تو اُن فارسی تاریخون مین جو اُن کی مخالف حکومتون کے متوسل یا موافق مصنفین نے لکھی ہین، دوسری وہ کتابین ہین، جو حافظ رحمت خان کے پوتون یا پرپوتون نے لکھی ہین، اب تک انگریز مصنفین یا بعد کے دوسرے مورخین مؤخر الذکر کتابون کو اس لئے نظر انداز کردیتے تھے کہ وہ ان کے اہلِ خاندان کی صرف مفاخر ہین، اس لئے ان کے حالات مین تنہا ماخذ اونہی مخالف مصنفین کی کتابین تھین، لیکن ہمارے نوجوان مؤلف نے اس نظریہ کو قبول نہین کیا، اور اپنے ماخذون مین اہلِ خاندان کی یہ کتابین بھی داخل کین، بلکہ انہی کو بڑی حد تک بنیاد و اساس قرار دیا، اور اصول درایت اور واقعات کا ماحول سامنے رکھ کر اُن الزامون کو دور کرنا چاہا، جو مخالف مورخین نے حافظ رحمت خان پر لگائے تھے،

اہلِ خاندان کی کتابون مین سے دو کتابین مبسوط و مفصل تھین، اور انہی دونون کو مؤلف نے خصوصیت سے اپنا ماخذ بنایا ہے، ایک نواب مستجاب خان کی گلستانِ رحمت، اور دوسری سعادت یار خان کی گلِ رحمت، مؤخر الذکر کتاب کا ایک نسخہ ہمارے کتبخانۂ دار المصنفین مین بھی موجود ہے، ہم نے بطورِ آزمائش اس کتاب کی اُس فصل کو سامنے رکھا، جو مرہٹون سے فیصلہ کن جنگ پانی پت کے حالات مین ہے، اور دوسری طرف سلاطینِ درانیہ کی مشہور تاریخ "تاریخِ احمد" مین جنگ پانی پت کے حالات نکالے، تاریخ احمد، مؤلفِ حیاتِ حافظ رحمت خان کے پیش نظر نہین رہی ہے، لیکن کٹھیر کے روہیلون سے اس غیر متعلق کتاب سے بھی ان واقعات کی تصدیق ہوتی ہے، جن کا تذکرہ جنگِ پانی پت کے بیان مین "گلِ رحمت" مین آیا ہے، اور جس کا اعتراف حافظ رحمت خان کے دوسرے مخالف مورخین مشکل سے کرتے ہین، مثلاً، نواب عنایت خان (پسر حافظ رحمت خان) کی جنگ مین نمایان خدمات اور جانبازی، "نمایان" وفاداری کی یہ مبارکباد "این فتح بتو مبارک باد و رحمتِ خدا بر تو و بر پدرِ تو"

پھر انھین خطاب وغیرہ سے سرفراز کرنا، یا اسی طرح نواب شجاع الدولہ کے متعلق یہ کہنا کہ یہی سردار تم مین غیر اولو
رہ جاتا ہے، مین اسے ساتھ لیجاتا ہون، وہان اس کی مملکت سے وسیع مملکت اسے دیدونگا" شاہ درانی کے
اس جواب مین "تاریخ احمد" مین ہے:-

"ہمہ سرداران خاموش ماندہ حق بر غاد دادند و حافظ الملک عرض کرد کہ درمیان او و نواب
ہیچ تغایر نیست ایشان اکثر بمگ ما می رسند، اگرچہ قبلۂ عالم نواب راہمراہ رکاب بردہ زیادہ ازین
سرفراز خواہند فرمود، اما مردم ہندوستان خواہند گفت کہ آخر قوم افاغنہ اتفاق نمودہ یک سردار
را کہ باقی ماندہ بود از ہندوستان بدر کردند، بہر کیف رفتن ایشان درحق ما خوب نخواہد شد"

درانی نے جواب دیا:-

"...... برائے خاطر شما می فرمودیم، قبول نہ کردید، مگر یاد دارید، کہ نتیجۂ این روزی بشما عائد خواہد شد" (ص ۱۱۵ ۱۱۶)

شاہ درانی کی پیشنگوئی حرف بحرف پوری اتری، لیکن ان واقعات کا تذکرہ سیر المتاخرین وغیرہ مین
موجود نہین، بلکہ سیر المتاخرین مین تو غریب عنایت خان کا نام تک نظر نہ آیا، بلکہ نواب نجیب الدولہ کے پہلو
بہ پہلو شجاع الدولہ کے خدمات اور پھر منصب وزارتِ عظمیٰ کا ذکر آیا ہے،

اس لئے اگر ان واقعات کی تصدیق "تاریخ احمد" سے نہ ہوتی تو گلِ رحمت وغیرہ کے بیانات کو خاندانی
ترفع کی نمود و نمایش پر قدرۃً محمول کیا جا سکتا تھا، اور اس موقع پر یہ امر بھی لائق ذکر ہے کہ تاریخ احمد کی
تصنیف کا زمانہ ۱۲۱۳ھ جو گلِ رحمت کے زمانۂ تصنیف ۱۲۴۹ھ سے پہلے ہے، اس سلئے اس کا بھی امکان نہین
کہ مؤلف تاریخ احمد نے گلِ رحمت سے واقعات نقل کر دیئے ہون،

تاہم اس کا یہ مقصد نہین کہ گلِ رحمت وغیرہ کی تمام روایتین لائق استناد ہین، ایک غیر جانبدار مورخ
کو ان کے مطالعہ کے وقت وہ واقعات و روایات علٰحدہ کر دینے پڑین گے جنھین اہل خاندان نے حافظ الملک
سے والہانہ عقیدت کے باعث محض خوش عقیدگی سے اُن کی جانب منسوب کر دیئے ہین، اگر ان کتابون کے

و لیکن تو ان روایات کے اخذ و قبول کرنے پر اس لئے مجبور تھے کہ وہ خاندانی روایتین بار بار اس کثرت سے انکے
کانون تک پہنچی تھین، کہ اُن کے نزدیک اُن کا ناقابل اعتماد ٹھہرنا دشوار تھا، لیکن ہمارے زمانہ کے مصنف" حیات
حافظ رحمت خان" کو خوش اعتقادی کی ان مشہور عام خاندانی روایتون کو تاریخی استناد کے ساتھ قبول نہ کرنا تھا
وہ ان دونون قسم کی روایتون مین بآسانی تمیز کر سکتے تھے،

اسی طرح اگرچہ ہمارے مصنف نے ایک "غیر جانبدار نقاد مورخ" کے بار بار دعاوی کے ساتھ اپنی کتاب کا آغاز
کیا ہے، لیکن نقد و جرح مین مصنف کے دلائل کی کمزوریان اس طرح آشکارا ہوتی ہین کہ صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ
عمداً اس الزام کو دور کرنے کی کوشش مین ہین، لیکن ایسے مواقع ساری کتاب مین دو تین سے زیادہ نہین،
اسی طرح حافظ الملک کی شاعری کی بحث تشنہ اور محل نظر ہے، اور نہ ان کے لئے شاعری ذریعۂ عزت ہے،

مصنف نے اسی رد و جرح مین حافظ رحمت خان کے مخالف مورخین مین سے سیر المتاخرین کے مؤلف
میر غلام حسین کو ان کی کتاب کی ایک عبارت اقتباس کر کے دکھانا چاہا ہے کہ وہ جنگ پٹنہ و بکسر مین انگریزون
سے ملے ہوئے تھے، اور شاہ عالم کو انگریزی کیمپ مین پہنچانا چاہتے تھے، حالانکہ مصنف سیر المتاخرین کی اس
منقبس عبارت مین جو کچھ تذکرہ آیا ہے، اس کا تعلق جنگ پٹنہ و بکسر کے بعد کے واقعات سے ہے، جب اوسکو واپسی مین
شجاع الدولہ کی طرف سے کھٹک پیدا ہوئی ہے اور اپنے اور اپنے والد کو اس نے شجاع الدولہ کے آیندہ کسی ارادۂ بد سے بچانا چاہا ہے،
ان نظری پہلوؤن سے علٰحدہ ہو کر اگر کتاب مین لغزشین تلاش کیجائین، تو اپنے ماخذون مین بعض
کتابون کے مصنفین کے غلط نام لکھ دینے، اور اردو کے عامی الفاظ "قریب المرگ" "یگانگت" ..... وغیرہ
کے استعمال کی شکل مین نظر آسکتی ہین، لیکن ایسی خردہ گیریان، کتاب کے ظاہری و معنوی دونون قسم کے محاسن
کے لحاظ سے کسی طرح مناسب نہین، البتہ مصنف کو اُس عہد کی بعض مشہور تاریخی شخصیتون پر اظہار خیال کرتے
ہوئے لب و لہجہ کو نرم اور ملائم رکھنا تھا، کہ وہ شخصیتین گذر گئین، ان کے نیک و بد اعمال اُن کے ساتھ گئے،
ہمارا فرض صرف یہ ہے کہ ان کے نیک و بد کردار کو تمیز کے ساتھ دکھا دین،

بہر حال یہ کتاب کافی محنت، جانفشانی، اور تلاش و تحقیق سے مرتب کیگئی ہے، اور ہم مصنف ہی کے الفاظ مین جو اُس نے "گلستانِ رحمت" کے مصنف کے حق مین استعمال کئے ہین، کہہ سکتے ہین کہ ...... "یہ کتاب لکھکر نہ صرف روہیلون کے نامور سردار بلکہ ایک پوری کی پوری قوم کو زندۂ جاوید کردیا" کہ اردو زبان مین یہ روہیلون کی غالباً سب سے پہلی مکمل تاریخ ہے، جس مین روہیلون کی آمد سے دورِ حاضر تک کے مکمل حالات اس طرح جمع کر دیئے ہین کہ کہین تشنگی باقی نہین رہتی، اور بلکہ نہ صرف روہیلکھنڈ بلکہ اس عہد کے شمالی ہند کا پورا نقشہ نگاہون مین گھوم جاتا ہے،

کتاب مین حافظ رحمت خان اور اُن سے متعلق متعدد رنگین تصویرین بھی ہین، اور یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ حافظ الملک کے موجودہ اہلِ خاندان نے مصنف کی جانفشانی کی قدر کی، اور کتاب کو نفیس طباعت کے ساتھ شائع کرایا،

کُلّیات حسن دہلوی،

مرتبہ مولوی مسعود علی محوی بی اے (علیگ) سابق سشن جج سرکار آصفیہ ضخامت مجموعی، ۷۳۰ صفحہ مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس، حیدرآباد دکن، قیمت درج نہین،

امیر حسن دہلوی، اور حضرت امیر خسرو باہم معاصر اور تصوف کے ایک ہی سلسلے مین منسلک ہین، لیکن دونون یکسان طور پر خوش قسمت نہین ہین، ریاست حیدرآباد کی فیاضی، اور نواب اسحاق خان مرحوم کے ذوق تصوف سے حضرت امیر خسرو کی متعدد مثنویان نہایت آب و تاب سے شائع ہو چکی ہین، لیکن امیر حسن کے دیوان کے قلمی نسخون سے تذکرون کے سوا اور کسی نے اب تک فائدہ نہین اٹھایا، لیکن مقام مسرت ہے کہ سرزمین حیدرآباد ہی سے اس دیوان کی اشاعت کے سروسامان بھی بہم پہنچے، اور ہز اکسلنسی سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے مصارف کا بار اپنے ذمہ لیکر اس دیوان کی طباعت و اشاعت کی خدمت مولوی مسعود علی بی اے (علیگ) سابق سشن جج سرکار آصفیہ کے متعلق کی اور ان کی دو ڈھائی سال کی کاوش و محنت سے اس دیوان کا ایک نہایت عمدہ اڈیشن جس کا نام نامی

ڈیشن ہے شائع ہوگیا،

حق یہ ہے کہ حضرت حسن دہلوی کا حق بھی اہل دکن ہی پر تھا، انھون نے سرزمین دکن مین وفات پائی، اور وہین اورنگ آباد کے قریب خلدآباد مین وہ خلد نشین مدفون ہین، کتاب کے آغاز مین اون کے مزار کا فوٹو بھی دیا گیا ہے اور ان کے دیوان کی اشاعت کی طرف سر مہاراجہ کشن پرشاد کی توجہ جن اسباب کی بنا پر مبذول ہوئی ہے ان مین اس مزار کو بھی دخل ہے، فوٹو کے بعد دو تین صفحون مین سر مہاراجہ کشن پرشاد بالقابہ کی تمہید ہے، جس مین انھون نے اس دیوان کی اشاعت کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے کے اسباب بتائے ہین، پھر ۶۰ صفحات مین مولوی مسعود علی محوی کا ایک پرمغز دیباچہ ہے، جس مین امیر حسن کے سوانح و شاعری وغیرہ سے بحث کیگئی ہے، اس کے بعد ۹ صفحون مین اس دیباچہ کا ضمیمہ ہے، جس مین اس دیوان کی ترتیب تصحیح و طباعت وغیرہ کا حال درج ہے، ترتیب کی شکل یہ ہے کہ ایک نسخہ کو اصل قرار دیا گیا ہے، اور جو غزلین یا نظمین اصل مین نہ تھین وہ دوسرے دیوانون سے نقل کرکے اس مین داخل کی گئی ہین، لیکن ان دیوانون کی کل تعداد پانچ سے زیادہ نہین، اور سب کے سب حیدرآباد کے کتب خانون سے تعلق رکھتے ہین، اگر فاضل مرتب نے حدودِ حیدرآباد سے قدم آگے بڑھایا ہوتا تو اور بھی بہت سے نسخے مل سکتے تھے، ایک قلمی نسخہ تو خود دار المصنفین کے کتبخانے مین موجود ہے، اور ایک نہایت عمدہ اور قدیم نسخہ نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خان شروانی کی لائبریری مین ہے، ان کے علاوہ اگر تلاش کیجاتی تو اور نسخے مل سکتے تھے، ان سب کے بعد اصل دیوان شروع ہو کر ۶۲۳ صفحات مین ختم ہوتا ہے، جس کا بیشتر حصہ تو غزلیات پر مشتمل ہے، ان کے علاوہ اخیر مین قصائد، رباعیات اور مثنویان وغیرہ ہین،

اس دیوان کا دیباچہ فاضل مرتب نے نہایت کاوش اور محنت سے لکھا ہے، سب سے پہلے امیر حسن کے حالات کے متعلق حسب ذیل تاریخون اور تذکرون کی اصل عبارتین نقل کی ہین،

(۱) تاریخ فیروز شاہی،

(۲) سیر الاولیا ، مولفہ محمد مبارک العلوی الکرمانی المدعو بامیر خورد ،

(۳) سیر العارفین حامد بن فضل اللہ المخاطب بہ جلال ،

(۴) تاریخ فرشتہ ،

(۵) اخبار الاخیار مولٰنا شاہ عبدالحق محدث دہلوی ،

(۶) تذکرۂ بہارستان شاہ نواز خان ،

اس کے بعد ان کے حالات لکھے ہیں ، اور جو باتین ان مین قابل تنقید تھین ، اور اونہی نے عام طور پر شہرت حاصل کر لی تھی ، ان کی تنقید کی ہے ، اور اس سے حسب ذیل نتائج نکالے ہین ،

(۱) ان کا مولد دلی نہیں بلکہ بدایون ہے ،

(۲) یہ واقعہ غلط ہے کہ امیر خسرو ایک نان بائی کی دوکان پر حسن کو دیکھ کر فریفتہ ہو گئے ،

اسی قسم کی اور بھی بعض تنقیدی باتین ہین ، اور اسی کے ساتھ جن بادشاہون اور سلطنتون سے امیر حسن کو تعلق رہا ہے ان کے متعلق بھی دلچسپ اور مفصل معلومات اس سوانح کا جزو ہین ، حالات کے بعد امیر حسن کی شاعری پر مفصل ریویو لکھا ہے ، پہلے تو وہ رائین نقل کی ہین جو امیر حسن کے کلام کے متعلق ان کے معاصرین ومتاخرین نے قائم کی ہین ، اور اسی سلسلے مین وہ اشعار بھی نقل کئے ہیں جو حسن نے اپنے اشعار کے متعلق تعلّی و تفاخر کے طور پر کے ہین ، کیونکہ ان سے اپنے کلام کے متعلق خود حسن کی راے معلوم ہوتی ہے ،

اس کے بعد خود اپنی راے ظاہر کی ہے ، اور ان کے کلام کی اہم خصوصیات بتائی ہیں ، ان کے منتخب اشعار نقل کئے ہیں ، اور سعدی اور امیر خسرو کی ہم طرح غزلون سے ان کا موازنہ کیا ہے ، اس طرح ایک علمی چیز اچھے قالب مین اہل نظر کے سامنے آگئی ہے ، یقین ہے کہ عام طور پر اسکی قدردانی کیجائے گی ،

"ع"

مطبوعات جدیدہ
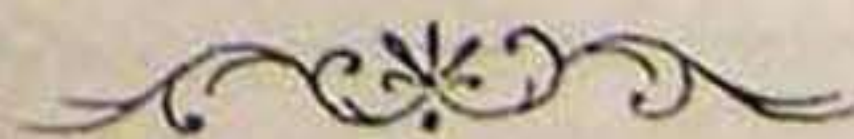
التصریح فی شرح التشریح ، از مولانا محمد عبدالاحد الہ آبادی مرحوم ، صفحے بڑی تقطیع کاغذ
مع حاشیۃ الجلیلۃ الفخیمۃ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ، ناشر جناب شیخ عبدالحق وکیل عدالت دیوانی ، الہ آباد ،

کتاب التصریح علم ہیئت کی مشہور ومتداول کتاب ہے ، مولانا عبدالاحد صاحب الہ آبادی نے اس پر حواشی لکھے تھے ، جو ابھی تک طبع نہین ہوئے تھے ، موصوف کے خلف الرشید جناب شیخ عبدالحق صاحب وکیل نے اوسے مدارس کے علماء و طلبہ کیلئے طبع کرایا ہے ، متن مین جلی قلم سے التصریح ، اور خفی خط مین قدیم عربی کتابون کے طرز پر حواشی ثبت ہین ، چونکہ عربی خوان کے درس مین یہ کتاب داخل ہے ، اور اون کو محشّی کتابون کی تلاش رہتی ہے ، اسلئے امید ہے کہ وہ اس نسخہ کی قدر کرین گے ،

رسالۃ المعراج ، از مولانا سید اشرف صاحب شمسی ، ناشر جناب سید جلال ید اللّٰہی تاجر کتب چھتہ بازار حیدرآباد دکن ، ۵۲ صفحے ، قیمت ۱۲ ؍

یہ رسالہ معراج نبوی کے تذکرہ مین ہی ، معراج کی تفصیل کر کے بتایا ہے ، کہ معراج جسمانی بذریعۂ براق ہوئی اور اسی کو مذہب حق لکھا ہے ، اور آخر مین محالات عقلی کو رد کیا ہے ،

خواجۂ ہندوستان ، از جناب سید حامد حسین اثر بی اے ، وکیل ، ۳۲ صفحے ، قیمت ۲ ؍ ، پتہ :-
نعمت اللہ جنرل مرچنٹ ، دار گیٹ ، اجمیر ،

اس مین حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ؒ کے سوانح حیات ومناقب و مساعی تبلیغ اسلام نظم مین بیان کیے گئے ہین

نعرۂ اتحاد، اس رسالہ مین جناب میر ولایت علی صاحب نے قرآن مجید کی تعلیمات پیش فرماکر دعوت دی ہو کہ صرف ایمان و عملِ صالح پر استوار ہو کر اسلام کے تمام فرقے متحد ہو جائین، رسالہ مؤلف سے محلہ اعظم پورہ حیدر آباد کے پتہ سے مفت مل سکتا ہو،

مساواتِ اسلامیہ، از جناب شیر محمد صاحب قادری کاکوروی نظیر آباد لکھنؤ، ۲۹ صفحے، قیمت ۲ر

اس رسالہ مین اسلامی مساوات کی تعلیمات پیش کی ہین، اور بتایا ہو کہ اسلام مین نسلی امتیازات کا اعتبار نہین،

القول الجامع فی تحقیق (عربی) از مولانا عبد الحق صاحب مدنی، مدرس مدرسۂ اسلامیہ،
جواز تعدد الجمع والجوامع مراد آباد، ۶۵ صفحے،

اس رسالہ مین دکھایا گیا ہے، کہ جمعہ کی نماز شہر کی مسجد جامع ہی مین صرف ہونی چاہیے، مسجد کی تنگی یا بُعدِ مسافت کے لحاظ سے ایک سے زیادہ مسجدون مین جمعہ کی نماز پڑھی جا سکتی ہے لیکن محلہ محلہ مسجدون مین جمعہ قائم کرنا جائز نہین، رسالہ پر مولانا حسین احمد صاحب و دیگر علماے دیوبند کی تصدیق و تقریظ درج ہین،

خمخانۂ امید، از جناب سید بشارت علی صاحب بشارت، دہلوی، ۴۴ صفحے، قیمت ۱ر، پتہ جناب ماسٹر سلامت علی صاحب مضطر، بیت البشارت، قرول باغ، دہلی،

یہ جناب بشارت دہلوی کی قومی نظمون کا مجموعہ ہے، اسمین بعض نظمین سیرت نبوی کے مختلف پہلوون پر ہین، اور اکثر نظمون مین نوجوانانِ اسلام کو اصلاحِ حال کی دعوت دی گئی ہے،

ریاضِ عبقری، از جناب حاجی محمد فاضل صاحب عبقری، بریلوی مرحوم ناشر منشی محمد کامل صاحب کاتب، پتہ نظامی پریس، قیمت :- عہ ۲۴۴، صفحے، لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ،

جناب حاجی محمد فاضل صاحب عبقری بریلی مین اردو کے کہنہ مشق قادر الکلام شاعر تھے، اور آج سے ربع صدی پیشتر کے رسائل مین اونکی غزلین اہتمام کے ساتھ چھپتی تھین، موصوف کا کلام ریاضِ عبقری کے نام سے چھپا ہے، یہ مجموعہ دو حصون پر مشتمل ہے، پہلے حصہ مین غزلیات ہین، اور اس پر جناب آسی چاندپوری کا مقدمہ ہی، دوسرے مین مذہبی قومی اور سیاسی نظمین ہین، اور اس پر جناب قمر صاحب بدایونی نے مقدمہ تحریر کیا ہے،

عثمانی قاعدہ، از جناب واحد و خانم، ۴۴ صفحے، پتہ کلیۃ القرآن نرسمراج روڈ بنگلور،

بچون کو قرآن مجید پڑھانے کیلئے یہ قاعدہ مرتب کیا گیا ہے، ابتدا مین اساتذہ کیلئے ہدایتین درج ہین،

گلبانگ، از جناب سید محمود اعظم فہمی، ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، ۴۰ صفحے، قیمت ۸ر

یہ جناب فہمی کی قومی و وطنی نظمون کا منتخب مجموعہ ہے نظمین پرجوش اور ولولہ انگیز ہین، کتاب مین کہین کہین املا کی غلطیان رہ گئی ہین، مثلاً "غیض و غضب" ص ۳۲

حدیثِ ادب، از جناب احسان بن دانش صاحب کاندھلوی، ناشر ذیشان بک ڈپو، مزنگ لاہور، حجم ۱۰۰ صفحے، قیمت ۱۲ر

جناب احسان بن دانش اردو کے نوجوان شعرا مین روشناس ہو چکے ہین، حدیثِ ادب ان کی غزلون کا مجموعہ ہے، مصنف نے عام طرز کے خلاف اپنے تعارف کے لئے کسی کے سامنے دستِ سوال نہین بڑھایا، بلکہ اپنے تعارف مین خود اپنے کلام کو پیش کیا ہے، جو یقیناً ان تعارف کے مقدمون سے زیادہ اثر انداز ہے، امید ہے کہ موصوف مستقبل مین ایک اچھے شاعر ہون گے، احسان بن دانش اردو شاعری کے "دورِ جدید" کے شاعر ہین، قوافی وغیرہ مین ان اصلاحات کے پابند ہین، جو قدیم شاعری مین دورِ حاضر کے شعرا نے رائج کی ہین،

خاقانیٔ ہند، از جناب میان محمد رفیق خاور ایم اے، رفیق منزل، باغبانپورہ، لاہور، ۴۰۰ صفحے تقطیع چھوٹی، کاغذ لکھائی چھپائی معمولی، **قیمت** عہ

خاقانیٔ ہند مین ذوق کی شاعری کا ایک مغربی انداز مین مطالعہ کیا گیا ہے، مؤلف کے پیش نظر سید عبد اللطیف صاحب کی کتاب "غالب" ہی، "خاقانیٔ ہند" کے ابواب بھی تقریباً وہی ہین، "اصولِ تنقید" "سوانح حیات" "ماحول اور اس کے اثرات" "ملکاتِ وجدان اور شخصیت" "موازنۂ ذوق و غالب" اصولِ تنقید تقریباً سب مغربی ٹکسال مین ڈھالے گئے ہین، مصنف نے ذوق کی شاعری کے تقریباً تمام اصناف کو قابلِ اصلاح قرار دیا ہے، ماحول اور اوس کے اثرات دکھا کر بتایا ہو، کہ ذوق معمولی

گھرانے کے ایک فرد تھے، بازاری مذاق طبیعت پر چھا گیا تھا، بازاری زبان اور محاورات بھی زبان پر چڑھ گئے تھے پھر امراء کی مصاحبت نے اس کڑوے کریلے پر اور نیم چڑھا دیا، آخر میں تجزیہ نکالا کہ "ذوق غیر فطری شاعر تھے" ہمکو صرف اسقدر کہنا ہے کہ اس رائے کے اظہار میں شدت برتی گئی ہے، اور ان میں سے بہت سے الزامات صحیح بھی نہیں ہیں، غزلوں میں گو اون کا رنگ خاص نہ ہو، مگر قصائد میں وہ بہرحال "خاقانیِ ہند" ہیں، اور اس لقب کا اون سے چھیننا آسان نہیں ہے،

تنقید کا صحیح معیار، از جناب کاظم، دہوی نمبر ۵۰۲۲، گلی شاہ تارا، دہلی، ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ لکھائی چھپائی معمولی، **قیمت**:- ۶ر

یہ مقامی شاعرانہ نوک جھونک کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جسمیں چند مختلف شعراء کے نام بڑھا کر رسالہ میں عمومیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، رسالہ میں اقبال، جوش، خانصاحب احمد حسین خان، خواجہ حسن نظامی، اکبر حیدرآبادی، اور یگانہ چنگیزی لکھنوی سابق مرزا یاس عظیم آبادی وغیرہ پر تنقیدیں ہیں، تنقید کی زبان اور لب ولہجہ قابل گرفت ہے، اسکو ہم تنقید کا صحیح معیار ہرگز نہیں کہہ سکتے،

میں منکر حدیث کیوں ہوا؟ ۳۰ صفحے، دفتر بلاغ امرتسر،

"خنگو" صاحب جو کبھی صوبہ متحدہ کے ایک رسالہ میں اپنی "تحقیقاتِ انیقہ" کی اشاعت فرماتے تھے، کسی خانگی مصلحت سے اب اونھوں نے چند سال سے صوبہ متحدہ کو چھوڑ کر صوبہ پنجاب کو اس کام کے لئے منتخب کیا ہے، حق کیلئے بیباکی اور بے خوفی کی یہ بہترین مثال ہے، اسی رسالہ میں موصوف نے "حدیث و تاریخ تدوینِ حدیث" پر مستشرقانہ وعیسائیانہ تحقیقات سے مرعوب و متاثر ہو کر اعتراضات کئے ہیں، اور اون کو "میں منکر حدیث کیوں ہوا" کے عنوان سے چھپوایا ہے، خنگو صاحب ایسے حق گو ہیں، کہ اون کو اپنے نام کے ظاہر کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوئی، حالانکہ اس صوبہ کے ہوم ممبر اب نہ نواب صاحب چھتاری ہیں، اور نہ نواب بہادر سر مزمل اللہ خان صاحب، یہ اون لوگون کا حال ہے، جو محدثین کرام پر سلاطینِ وقت سے ڈرنے اور اون کی چاپلوسی میں اسلام کے بگاڑنے کا الزام قائم کرتے ہیں، بہرحال ان اعتراضات کے جوابات بار بار دئے جا چکے ہیں، تاہم یہ معترض کے نزدیک "قند مکرر" ہے، جسکو بار بار

دہرا کر اپنے علم و فضل کی منادی کرنے میں لطف آتا ہے، حالانکہ اہل علم کی نگاہ میں اوس سے اون کی جہالت کا پردہ بار بار فاش ہوتا ہے،

نصرة الحدیث، از مولانا ابو المآثر حبیب الرحمن صاحب مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو اعظم گڈھ، حجم ۱۳۱ صفحے

پتہ:- مولوی پیرزادہ محمد بہاء الحق قاسمی منزل، دروازہ گلوالی امرتسر،

یہ اوسی مذکورۂ بالا زہر کا تریاق ہے، جو قصۂ زمین برسر زمین کے اصول پر امرتسر سے شائع کیا گیا ہے، اس رسالہ میں رسالۂ سابق کے تمام تدلیسات کا پردہ بدلائل چاک کیا گیا ہے، اور تمام دلائل اور بیانات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے گئے ہیں، ناشر کے پاس ۵ر کے ٹکٹ بھیجنے پر رسالہ ملسکتا ہے،

الارشاد الی سبیل الرشاد، مؤلفہ مولوی پیرزادہ محمد بہاء الحق قاسمی منزل دروازہ گلوالی امرتسر

حجم ۶۰ صفحے، **قیمت**:- ۲ر

یہ رسالہ "بریلوی و حنفی مناظرات" کے مسائل بشریتِ انبیاء، اور علم غیب نبوی وغیرہ میں ہے جس میں احناف کی طرف سے بریلیون کو جوابات دیئے گئے ہیں،

جگر و اصغر کے سو سو شعر، مرتبہ جناب محمود علی خان صاحب، **قیمت** ہر ایک ۴ر، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ، قرول باغ، دہلی،

مکتبہ جامعہ نے ان دونوں شعراء کے سو سو شعر منتخب کرا کر جیبی تقطیع پر خوش خط، و خوش منظر رسالہ کی شکل میں شائع کیا ہے، دونون کے سرورق پر دونون شعراء کی تصویریں ہیں، اور اندر مرتب کی طرف سے شعراء کے سوانح، پر اشعار درج ہیں، گو انتخاب کا معاملہ تمامتر ذوقی ہے، تاہم منتخبات اکثر قابل انتخاب ہیں،

باز کے سو شعر، مرتبہ جناب محمد واجد علی خان جاوید، پتہ:- کاشانۂ باز، بازار گھانسی حیدرآباد دکن،

اوسی طرز پر حیدرآباد کے شاعر جناب محمد تراب علی خان صاحب باز کے سو شعر منتخب کر کے چھاپے گئے ہیں، ابتدا میں جناب حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی کا تعارف نامہ پھر جناب باز کی مختصر سرگذشت اور پھر منتخب اشعار ہیں،

نوادر، مؤلفہ جناب مرزا محمد عسکری بی اے، حکیم عبد العزیز روڈ لکھنؤ، ۱۰۰ صفحات تقطیع چھوٹی قیمت عمر

یہ لطائف و ظرائف کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے، جو عربی فارسی اور انگریزی کے لطائف کے مجموعون سے مرتب ہوا ہے کہین کہین مصنف نے اپنے اور اپنے ملنے والون کی دلچسپ روایتین بھی درج کی ہین، ان لطائف و ظرائف کو مختلف عنوانون مین تقسیم کیا ہے، مثلاً آنحضرت صلعم، صحابہ، ائمہ، محدثین، فقہاء، قضاۃ، علماء وغیرہ کے لطائف علحدہ علحدہ اسی طرح مختلف ممالک کے شعراء کے لطائف جداگانہ ہین، پھر اسی نوعیت سے شعر کے لطائف، عدالتی لطائف، علمی تعلیمی لطائف اور کاروباری لطائف، پھر چورون، پرخورون اور طفیلیون کے لطائف درج ہین، کتاب دل بہلانے کیلئے بیحد دلچسپ اور اچھے انداز بیان مین لکھی گئی ہے، ہمارے ہندوستان کے مختلف مشاہیر کے دلچسپ لطائف بھی خوب ہین، آخر مین فہرست اسماء منسلک ہے،

چراغ امین، از فکری سلطان پوری، پتہ کنور احمد اعتبار حسین خان ہاری مئو، ڈاکخانہ جگدیش پور ضلع سلطان پور، حجم ۹۶ صفحے، قیمت ۱ عار

کنور احمد صیانت الزمان صاحب فکری سلطانپوری کے کلام کا یہ مجموعہ ہے، یہ مجموعہ بجائے کسی شخص خاص کے ملک کے تیرہ مشاہیر کے نام معنون ہے، اور غالباً یہ اس مجموعہ کی سب سے پہلی جدت ہے مجموعہ دو حصون مین منقسم ہے ایک نظمیات جسمین مختلف عنوانات پر نظمین ہین، جیسے اعلان صداقت، صلاح الدین ایوبی، شعرائے لکھنؤ سے خطاب احساس غیرت، اپنی قوم سے خطاب، دوسرا حصہ، غزلیات پر مشتمل ہی، جو ترتیب حروف تہجی کے عام اصول کے خلاف، بغیر کسی خاص ترتیب کے جمع کئے گئے ہین، آخر مین چند صفحے متفرقات کے ہین، شعر کی زبان صاف اور طرز ادا پسندیدہ ہے، شاعر، سید حسرت موہانی، حضرت جگر، اور اصغر کے طرز کلام سے متاثر معلوم ہوتا ہے،

مشاہیر امت، از قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، پتہ، کتبخانہ مطبع قاسمی دیوبند، ص ۱۰۴، قیمت ۱ عمر

علامہ ذہبی نے اپنے ایک مکتوب مین جو تاریخ الخلفاء مین درج ہے، مختلف علوم و فنون کے بانی،

اور اکابر اور ممتاز اخلاقی صفات سے متصف صحابۂ کرام کے نام یکجا کئے ہین، قاری صاحب نے اپنی طالب علمی کے عہد مین ان بزرگون کے نامون کو عربی نظم مین پرویا تھا، اب اونھون نے اپنی اس عربی نظم کی اردو مین شرح لکھی ہے، اور ان دونون کے مجموعون کو مشاہیر امت کے نام سے چھپوایا ہے، شرح مین ان اشخاص کے مزید حالات جن سے ان کے اوصاف خاص کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے، لکھے ہین،

بہاء اللہ اور میرزا، از مولانا ثناء اللہ امرتسری، ۹۰ صفحے، پتہ کتب خانہ ثنائیہ امرتسر، قیمت ۴ر

ایران کے بہاء اللہ اور قادیان کے مرزا غلام احمد کے دعاوی اور دلائل خود انہی کے الفاظ مین دکھا کر ثابت کیا گیا ہے، کہ میرزا صاحب اپنے دعودن اور دلیلون مین مجتہد نہین، بلکہ بہاء اللہ کے مقلد ہین، آخر مین بہائی مذہب کے عقائد لکھے ہین،

ارکان اسلام، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ضخامت ۴۴ صفحے، قیمت ۲ر

بچون کیلئے یہ دینیات کی چوتھی کتاب ہے، اس مین اسلام کے ارکان خمسہ، کلمۂ شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی تفصیل ہی، اور بچون کے فہم کے مطابق ہر ایک کے آسان مسائل لکھے ہین زبان صاف اور آسان رکھی گئی ہے امید ہے بچون کیلئے یہ کتاب مفید ہو گی، اور وہ اسکو دلچسپی کے ساتھ پڑھین گے،

افلاس ہند، اور اس کے متعلقہ معاشیاتی مسائل، تقطیع خرد ضخامت ۱۱۴ صفحے، مطبوعہ اسٹار پریس الہ آباد

گجرات کالج بمبئی کے پروفیسر معاشیات جی فندوے شیراز ایم اے، نے افلاس ہند اور اوس کے متعلقہ معاشی مسائل پر ایک خاص نقطۂ نظر سے ایک مختصر رسالہ انگریزی مین لکھا تھا جس کی قدر ہندوستان کے سرکاری حلقون مین بہت زیادہ کی گئی، جناب راغب احسن صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہی، کتاب ایسے مسائل و مباحث پر مشتمل ہی، جنکی اردو دان طبقہ کو سخت ضرورت ہے، یہ مباحث و معلومات گو خاص ترتیب کے ساتھ اور خاص نتائج نکالنے کیلئے مرتب کئے گئے ہین، تاہم توسیع علم کیلئے اون کا مطالعہ بہرحال مفید ہے،

نوجوان ورتھر کی داستان غم، مترجمہ ریاض الحسن صاحب ایم اے، پتہ لٹریری سنڈیکیٹ

نمبر ۱ ہیلی روڈ، الہ آباد، ص ۴۴۴ صفحے، قیمت عہ

مشہور جرمن فلاسفر اور ادیب و شاعر نے اس نام سے ایک دلچسپ داستانِ حیات لکھی تھی، جو یورپ مین بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی، ریاض الحسن صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہین، کہ اونھون نے اس کا اردو ترجمہ کیا اور ساتھ ہی اس پر ۵۰ صفحون کا ایک مقدمہ لکھا ہے، جسمین گوئٹے کی سوانحِ زندگی، تصنیفات، اور فلسفہ پر تبصرہ کیا ہے، کتاب نہایت دلچسپ، مفید اور انسانی نفسیات کے پوشیدہ اسرار کی ترجمان ہے، ترجمہ مین سلاست و روانی کی کوشش کی گئی ہے، تاہم تعجب ہے کہ زبان کی غلطیان جابجا نظر آتی ہین، شاید مترجم کو اپنے ترجمہ پر نظرِ ثانی کی فرصت نہین ملی،

سوال و جواب تصوراتِ قطبی، از مولوی محمد شریف صاحب مصطفےٰ آبادی سلیمانی پریس بنارس،

قطبی عربی منطق مین ایک مشہور و متداول کتاب ہے، اور عربی مدارس کے کورس مین عموماً داخل ہے، مولوی محمد شریف صاحب نے انھیں طلبہ کی فیض رسانی کے لئے اس کتاب کے حصۂ تصورات کے مسائل کو فارسی زبان مین سوال و جواب کی صورت مین مرتب کیا ہے،

شعر الحکم، جلد دوم از ضامن حسین صاحب نقوی گویا، جہان آبادی، پتہ:- مصنف سے عدالت ججی بریلی سے ملے گی، **قیمت** عمر، ۱۸۰ صفحے،

یہ گویا جہان آبادی صاحب کی مختلف نظمون کا دلچسپ مجموعہ ہے، شروع مین مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے قلم سے چند صفحون کا تعارف نامہ ہے، پھر مصنف کے مختصر دیباچہ کے بعد اصل کتاب کے ابواب ہین، کتاب تین بابون پر منقسم ہے، پہلا غزلون اور رباعیون کا مجموعہ ہے، دوسرا نعت و مناقب کا، اور تیسرا مختلف نظمون کا، گویا کی نظمین نہایت صاف ستھری اور کہین کہین فلسفیانہ رنگ مین ڈوبی ہوئی ہین، رباعیات بھی عموماً صاف اور رواں اور شگفتہ ہین، کہین کہین تو کلامِ اکبر کا دھوکا ہوتا ہے، حسرت کا رنگ بھی صاف جھلکتا ہے، امید ہے کہ اردو کے شائقین اسکی قدر کرین گے،

"س"

جلد ۳۴ | ماہ رجب سنہ ۱۳۵۳ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۴ء | عدد ۵

مضامین